ماہنامہ

جلد: ۹۳ | ذیقعدہ ۱۴۳۰ھ مطابق نومبر ۲۰۰۹ء | شمارہ: ۱۱

نگراں

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب
استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ۔ ۲۴۷۵۵۴ یوپی

ہندوستان سے فی شمارہ -/۱۵ روپے، سالانہ -/۱۵۰ روپے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۱۱۰۰ روپے

بنگلہ دیش سے سالانہ -/۵۰۰ روپے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۵۰۰ روپے

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Mob. : 09411649303 *(Manager)*
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

R. N. I. No. 2133/57

DARUL ULOOM Monthly (Urdu) Printed, Published by Maulana Marghubur Rahman,
Owned by Darul Uloom Grush. Published From Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at Darul Uloom Printing Press Deoband, Saharanpur
Editor : Maulana Habibur Rahman Azmi

فہرست مضامین

○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات جناب مولانا شیر محمد صاحب ناظم جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن اعظمی

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ اسلام کے نام لیوا اوراس کے شیدائیوں کے مقابلہ میں اسلام کے مخالفین ومعاندین کی تعداد ہر دوراور ہر زمانہ میں زیادہ رہی ہے اوراسلام کواپنے ابتدائے قیام سے آج تک نہ جانے کتنے فتنوں سے دوچار ہونا پڑا ہے، لیکن اس تاریخی شہادت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ علمائے اسلام اور صلحائے امت نے ان تمام فتنوں کا نہایت پامردی سے مقابلہ کیا ہے اوراسلام کے حریفوں کو ہر محاذ پر شکست دے کر اسلام کے کارواں کو آگے بڑھایا ہے۔

چنانچہ اسلام پر اوّل ترین حملہ مادیت کی راہ سے ہوا موروثی حکومت کے تسلسل اور دولت وثروت کی فراوانی سے اسلامی معاشرہ میں تعیش اور راحت پسندی کا عمومی رجحان پیدا ہوگیا تھا جس سے یہ خطرہ ہوچلا تھا کہ خدانخواستہ ملت اسلامیہ بھی اگلی امتوں کی طرح تعیش کی نذر نہ ہوجائے اس فتنہ کے مقابلہ کیلئے حضرات تابعین کی جماعت میدان میں نکل پڑی اوراپنے وعظ ونصیحت، دعوت وتبلیغ اور حرارت ایمانی کے ذریعہ مادیت کے اس سیلاب بلاخیز کوآگے بڑھنے سے روک دیا اورامت کواس طوفان سے بچالیا۔

اس کے بعد اسلام پر دوسرا حملہ عقلیت کی راہ سے ہوا، یونانی فلسفہ نے سطحی ذہنوں کو اپنی گرفت میں لے کر اسلامی عقائد واعمال کے خلاف ایک طوفان کھڑا کردیا جس سے متاثر ہوکر امت دوحصوں میں تقسیم ہوگئی ایک کی قیادت فقہاء اور محدثین کررہے تھے اور دوسرے

کی عقلیت زدہ معتزلہ۔ یہ فتنہ چونکہ علمی انداز میں برپا کیا گیا تھا اور بدقسمتی سے حکومتِ وقت کی سرپرستی بھی اسے حاصل ہوگئی تھی، اس لئے ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ اسلامی علوم وعقائد یونانی افکار ونظریات کے مقابلہ میں اپنی توانائی اور سربلندی قائم نہ رکھ سکیں گے، ان سنگین حالات میں علماء ہی کی صف سے ایک بزرگ سر سے کفن باندھ کر میدان میں کود پڑے اوراس جرأت واستقامت کے ساتھ کہ خلیفۂ وقت مامون الرشید کے تہدیدی فرامین اور معتصم باللہ کے طوق وسلاسل اورتازیانے ان کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہ کرسکے بالآخراس مردجلیل کی ثابت قدمی کی برکت سے یہ فتنہ سرد پڑگیا اورامت ایک عظیم وتباہ کن خطرہ سے مامون ومحفوظ ہوگئی۔

تیسری صدی میں معتزلہ نے اپنی عقلیت پسندی اوراپنی بعض نمایاں شخصیتوں کے سہارے اس سوئے ہوئے فتنہ کو پھر سے جگانا چاہا، لیکن امام ابوالحسن اشعری جو پہلے انھیں کے کیمپ کے ایک فرد تھے اوران کے تمام ہتھکنڈوں سے اچھی طرح واقف تھے ان کے مقابلہ میں آگئے اور بحث ومناظرہ اورزبانی تفہیم وتقریر کے ذریعہ ان کے حوصلوں کو پست کردیا اورآئندہ ان کے مقابلے کیلئے ایک سو سے زائد نہایت اہم اور وقیع کتابیں بھی تصنیف کردیں، اورساتھ ہی اپنے تلامذہ کی ایک اچھی خاصی جماعت بھی تیار کردی جس نے ہرعلمی محاذ پرمعتزلہ کا تعاقب کیااورانھیں میدان چھوڑنے پر مجبور کردیا۔

معتزلہ کی اس شکست کے بعداسی فلسفۂ یونان کی کوکھ سے ایک نئے فتنہ نے جنم لیا جو اسلام کے حق میں اعتزال سے بھی زیادہ خطرناک تھا، یہ تھا باطنیت کا فتنہ اس فتنہ کے بانیوں نے اپنی ذہانت اور یونانی فلسفے کی مدد سے دین اسلام کے اصول ونصوص اورقطعیات میں تحریف وتنسیخ کا دروازہ کھولدیا اوراسی کے ساتھ اسلام واہل اسلام کے خلاف قوت وطاقت کا مظاہرہ بھی کیا جس کی بنا پر اسلامی حکومتیں عرصہ تک پریشان رہیں اوراسلام کی بہت سی منتخب شخصیتیں اس تشدد آمیز فتنہ کا شکار ہوگئیں۔

اس عظیم فتنہ کی سرکوبی کیلئے بھی صف علماء ہی سے ایک مردکامل آگے بڑھے جنھیں ہم امام غزالی کے نام سے جانتے پہچانتے ہیں انھوں نے براہ راست باطنیوں سے مقابلہ آرائی کے بجائے فلسفہ یونان کونشانہ بنایا جواکثر فرقِ باطلہ کا ماخذ ومصدر تھا اوراپنے علمی تبحر، قوت

استدلال سے اس کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں اور ان فتنوں کے چشموں کو ہمیشہ کیلئے بند کردیا، امام غزالی کے ساتھ اس اہم خدمت میں امام رازی اور ابن رشد کے کارنامے بھی بھلائے نہیں جاسکتے۔

خیر یہ سارے واقعات تو زمان ومکان کے اعتبار سے آپ سے دور تر ہیں، خود اپنے ملک ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالئے، عہد اکبری میں ''دین الٰہیہ'' کے عنوان سے اسلام کے خلاف جو عظیم فتنہ رونما ہوا تھا جس کی پشت پر اکبر جیسے مطلق العنان فرماں روا کی جبروتی طاقت بھی تھی، لیکن حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شیخ عبدالحق دہلویؒ اور ان کے ہمنوا علماء نے اپنے پایۂ استقامت سے اس فتنہ کے سر کو ہمیشہ کیلئے کچل دیا۔

اور اس آخری دور میں سلطنت برطانیہ کے جلو میں الحاد وزندقہ کا فتنہ نمودار ہوا تھا اس کے مقابلہ میں بھی اگر کوئی جماعت نبرد آزما نظر آتی ہے تو وہ علماء ہی کی جماعت ہے، جنھوں نے سفید فام انسان نما وحشی درندوں کے ہر جور وستم کو برداشت کرکے اسلام اور آئین اسلام کی حفاظت کی، اور شہر شہر، قصبہ قصبہ اور قریہ قریہ مدارس کی شکل میں انسان کی چھاؤنیاں قائم کرکے پورے ملک میں اسلام کے سپاہیوں کا ایک جال بچھا دیا۔

اور خدا کا شکر ہے کہ اسلام کے یہ سپاہی آج بھی اسلام کے عقائد واعمال کی حفاظت و اشاعت میں پورے طور پر مصروف ہیں، یہی وجہ ہے کہ اسلام کی جڑیں دیگر بلاد اسلامیہ کے مقابلہ میں ہمارے ملک میں زیادہ مضبوط ہیں اور ہم بحمد اللہ اس پوزیشن میں ہیں کہ معاندین اسلام کی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر کہہ سکتے ہیں۔

ادھر آ اے ظالم ہنر آزمائیں
تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

اس لئے آج کے نام نہاد اسلام کے ہمدردوں کو علمائے اسلام پر اعتراض کرنے سے پہلے ان کے کارناموں پر غور کرنا چاہئے، مجھے یقین ہے کہ جو لوگ جماعت علماء پر قوم کے استحصال کا الزام لگاتے ہیں اگر انھیں اسلامی علوم وعقائد اور دینی اخلاق وکردار کے تحفظ وبقا اور اس کے استحکام واشاعت کے سلسلے میں علمائے اسلام کی خدمات سے ادنیٰ واقفیت بھی ہوتی تو وہ انھیں مورد الزام ٹھہرانے کے بجائے ان کے شکر گذار ہوتے۔

تاریخ اور تجربہ کی بنیاد پر بلاخوف وتردد یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ موجودہ دور میں اور آئندہ بھی علمائے دین ہی کی جماعت اسلام اور مسلمانوں کی پشتیبان بن سکتی ہے بلند بانگ دعووں، خوش کن تجویزوں اور جذباتی تقریروں سے کچھ دیر کیلئے گرمیٔ محفل کا سامان فراہم کیا جاسکتا ہے اور ہوش سے عاری پرجوش نوجوانوں سے زندہ باد کا نعرہ بھی لگوایا جاسکتا ہے، لیکن ان خالی دعووں سے کسی سنجیدہ، مستحکم، اور ٹھوس نتائج کی توقع نہیں کی جاسکتی کیونکہ بقول امام مالکؒ ماضی سے مضبوط رشتہ کے بغیر امت کی صلاح وفلاح کا تصور ایک فریب ہے، اور آج جو بھی ملت کے درد سے بے چین ہوکر اٹھتا ہے وہ سب سے پہلے ملت کے ماضی ہی پر تیشہ چلاتا ہے، آج کل کے نوخیز قائدین کو یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہئے کہ ماضی کے آئینہ کو داغدار بناکر تابندہ حال اور روشن مستقبل کا خواب دیکھنا، سراب کو آب زلال سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہونا ہے، اسلاف کے نقش قدم سے ہٹ کر جو کارواں بھی زندگی کی راہوں کی تلاش میں نکلے گا وہ مقبروں کی بھول بھلیوں میں بھٹک کر رہ جائے گا۔

۹۴ آل عمران-۱۷۰

بدیہیات قرآن

حکمتیں اور فائدے (۸/۱)

از: محمد عارف جمیل مبارک پوری
ڈربن، ساؤتھ افریقہ

۱- فرمان باری

فرحين بما آتاهم الله من فضله ويستبشرون بالذين لم يلحقوا بهم من خلفهم أن لا خوف عليهم ولا هم يحزنون ،يستبشرون بنعمة من الله وفضل وأن الله لا يضيع أجرالمؤمنين [آل عمران/۱۷۰-۱۷۱]

''وہ خوش ہیں اس چیز سے جوان کو اللہ نے اپنے فضل (وکرم) سے عطا فرمائی، اور جو لوگ ان کے پاس نہیں پہنچے ان سے پیچھے رہ گئے ہیں، ان کی بھی حالت پر وہ خوش ہوتے ہیں کہ ان پر بھی کسی طرح کا خوف واقع ہونے والا نہیں، اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔ وہ خوش ہوتے ہیں اللہ کی نعمت وفضل سے، اور اس بات سے کہ اللہ ایمان والوں کی مزدوری ضائع نہیں کرتا''۔

اس آیت میں دو مقام پر بدیہیات ہیں:

مقام اول

اوپر آچکا ہے کہ انہیں اپنے حالات اور اپنے اوپر فضل الٰہی سے فرحت ہوگی، فرحت اور ''استبشار'' ایک ہی چیز ہے، پھر اس کو دوبارہ بیان کرنے میں کیا حکمت ہے؟

اس میں دو حکمتیں بیان کی گئی ہیں

اول: استبشار سے مراد، فرحتِ تامہ ہے، لہٰذا اس میں تکرار نہیں۔ یہ جواب رازی نے نقل کیا ہے۔(۱)

دوم: فرحت سے مراد، سردست انہیں جو اللہ نے عطا فرمایا ہے، اس پر خوشی ہے، اور ''استبشار'' سے مراد، وہ خوشی ہے، جس کے بارے میں انہیں معلوم ہے کہ آخرت میں ان کو ملے گی۔(۲)

مقام دوم

یہاں پر "یستبشرون "فعل کومکرر لایا گیا ہے، اس میں کیا حکمت ہے؟

اس اشکال کے کئی جوابات دیے گئے ہیں۔

۱- ان افعال کے متعلقات الگ الگ ہیں: پہلے "یستبشرون "کا تعلق، ان لوگوں کے حالات سے ہے، جوان سے پیچھے رہ گئے، اور ابھی ان سے نہیں ملے، جب کہ دوسرے کا تعلق، ان کے اپنے حالات سے ہے۔ لہٰذا اس میں تکرار نہیں۔ یہ جواب: رازی، ابوسعود، آلوسی اور شوکانی نے لکھا ہے، ابوحیان نے اس کو "ظاہر" قرار دیا ہے۔(۳)

۲- اگر "نعمۃ"اور "فضل"کو "استبشارِ "اول کا بیان مانا جائے تو فعل میں تکرار، تاکید کے لیے ہے۔ زمخشری لکھتے ہیں

"فعل یستبشرون" کو مکرر لایا گیا تا کہ اس کے ساتھ اس نعمت وفضل کو متعلق کیا جاسکے، جو (لاخوف علیهم ولا هم یحزنون) کا بیان ہے، اور یہ کہ یہ ان کو ان کے ایمان کا اجر وصلہ ہے، اللہ کے عدل وحکمت کا یہی واجبی تقاضا ہے کہ انہیں یہ ملے، اور ضائع نہ ہو"۔(۴)

ابوحیان نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے:

"زمخشری کا یہ کلام اعتزالی نظریہ کے موافق ہے کہ ایمان پر اجر وثواب کا ملنا واجب ہے۔ لیکن ابن عطیہ نے اہلِ سنت کے طریقے پر چلتے ہوئے لکھا ہے کہ "ان کے "استبشار" کی تاکید، دوبارہ (یستبشرون) کے ذریعہ کی، پھر (فضل) کے ذریعہ یہ بیان فرمایا کہ جنت میں ان کا داخلہ اللہ کے فضل کے ذریعہ ہوگا، کسی کے عمل کی وجہ سے نہیں۔ البتہ جنت کی نعمتوں اور درجات کے بارے میں یہ خبر دی گئی ہے کہ وہ اعمال کے لحاظ سے ہوں گے"۔(۵)

سوم: "استبشار" اول دفعِ مضرت کی وجہ سے ہے، اور "استبشار" دوم، اسباب مسرت کے حصول کی وجہ سے ہے۔ یہ جواب آلوسی نے لکھا ہے۔(۶)

۲-فرمان باری

ولایحزنك الذین یسارعون فی الکفر انهم لن یضروا اللّٰه شیئا یرید الله ألا یجعل لهم حظا فی الآخرة ولهم عذاب عظیم)[آل عمران/۱۷۶]

"کفر میں آگے بڑھنے والے آپ کو غم میں نہ ڈالیں، یہ اللہ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے کہ آخرت میں ان کیلئے کوئی حصہ نہ عطا کرے، اور ان کیلئے بڑا عذاب ہے"۔

یہاں سوال یہ ہے کہ ارادہ الٰہی کے ذکر کرنے میں کیا حکمت ہے، اگر صرف یوں کہہ دیتے کہ اللہ ان کو آخرت میں کوئی حصہ عطا نہ کرے گا تو بھی کلام تام تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس ٹکڑے میں یہ بتانا مقصود ہے کہ ان کی محرومی اور عذاب کا محرک و سبب بالکل قطعی اور ثابت ہو چکا ہے، اور کوئی رکاوٹ نہ رہی، کہ یہ کفر میں بہت آگے بڑھ گئے ہیں، اس میں یہ تنبیہ ہے کہ یہ لوگ سرکشی پر مصر ہیں، اور اس کی انتہا کو جا پہنچے ہیں، یہاں تک کہ وہ ذات جو ارحم الراحمین ہے، وہ بھی ان پر رحم نہیں کرنا چاہتی۔

یہ جواب زمخشری نے لکھا ہے۔(۷)

۳۔فرمان باری

ان الذین اشتروا الکفر بالایمان لن یضروا اللّٰہ شیئا ولھم عذاب الیم [آل عمران/۱۷۷]

''جن لوگوں نے ایمان کے بدلہ کفر خریدا وہ ہرگز اللہ کا کوئی نقصان نہیں کر سکتے، ان کے لیے دردناک عذاب ہے''۔

یہاں پر آیت میں تکرار ہے، اس لیے کہ اس سے پہلے فرمایا (ولا یحزنك الذین یسارعون فی الکفر انھم لن یضروا اللّٰہ شیئا یرید اللّٰہ الا یجعل لھم حظا فی الآخرۃ ولھم عذاب عظیم)[آل عمران/۱۷۶] پھر اس آیت میں فرمایا(ان الذین اشتروا الکفر بالایمان لن یضروا اللّٰہ شیئا ولھم عذاب الیم) [آل عمران/۱۷۷]اس تکرار کا فائدہ کیا ہے؟

اس کے کئی جواب دیے گئے ہیں

اول۔فرمان باری (ولا یحزنك الذین یسارعون فی الکفر انھم لن یضروا اللہ شیئا یرید اللہ الا یجعل لھم حظا فی الآخرۃ ولھم عذاب عظیم)[آل عمران/۱۷۶] تمام کفار کے حق میں ہے، اور اس کے بعد کی آیت بھی تمام کفار کے حق میں ہے، اور تکرار کا فائدہ تاکید ہے۔ یہ جواب زمخشری، ابوحیان، ابوسعود، آلوسی اور شوکانی نے لکھا ہے، اور شوکانی نے اس کو راجح قرار دیا ہے۔(۸)

دوم۔امام رازی نے اس کے فوائد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس تکرار میں کئی باتیں فائدے کی ہیں

(۱) جن لوگوں نے ایمان کے بدلہ کفر خریدا بلاشبہ پہلے وہ کافر تھے، پھر مسلمان ہوئے، پھر

کفر کیا۔ اس سے ان کے سخت اضطراب، رائے کی کم زوری، اور عدم ثباتی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور اس طرح کے انسان سے نہ کسی کو کوئی خوف ہوسکتا ہے، نہ اس کا کوئی رعب و دبدبہ ہوتا، اور نہ ہی ایسا انسان دوسرے کو ضرر پہنچانے پر قادر ہوتا ہے۔

(۲) دین کا معاملہ سب سے اہم اور سب سے نازک ہے، اور اس طرح کے امور میں انسان کوئی مثبت یا منفی پہلو اختیار کرنے سے پہلے، ہزار بار سوچتا ہے۔ غور وفکر کو کام میں لاتا ہے، لیکن یہ لوگ اس طرح کے نازک مسئلہ میں بھی، نہایت معمولی اسباب، اور حقیر محرکات کی وجہ سے بھی کوئی مثبت یا منفی قدم اٹھالیتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بے عقل، اور نہایت بے وقوف ہیں۔ ایک عقل منداس طرح کے لوگوں کی طرف نظرِ التفات بھی نہیں کرتا۔

(۳) ان میں سے اکثریت تو ان لوگوں کی ہے، جو کسی شبہ کی وجہ سے آپ کے ساتھ دینی نزاع نہیں رکھتے؛ بلکہ محض حسد اور منصب کی خاطر آپ سے دشمنی رکھتے ہیں، اور جس کی عقل ہی اتنی ہو کہ وہ حقیر دنیا کی خاطر آخرت کی عظیم سعادت کو فروخت کردے، وہ حد درجہ احمق ہے۔ اور ایسا انسان دوسرے کو کیا نقصان پہچاسکتا ہے۔ اس آیت کے تکرار میں یہی فائدہ ہے۔ (۹)

سوم۔ پہلی آیت (ولا یحزنك الذین یسارعون فی الکفر انھم لن یضروا اللہ شیئا یرید اللہ الا یجعل لھم حظا فی الآخرۃ ولھم عذاب عظیم) منافقین یا مرتدین یا کفار قریش کے ساتھ خاص ہے، اور یہ اس صورت میں تاکید کے لیے تکرار کی قبیل سے نہیں؛ بلکہ تمام کفار کے بارے میں یہ حکم ہے کہ وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، اور اس عموم میں یہ خاص افراد بھی داخل ہیں۔ اور ان کے حق میں یہ حکم تاکید کے طور پر ہوگا۔ اور اس طرح خاص افراد کے لیے، عذاب کی دونوں انواع (بڑا اور دردناک عذاب) جمع کردی گئی ہیں۔ یہ جواب زمخشری، ابوحیان؛ ابوسعود، آلوسی اور شوکانی نے نقل کیا ہے۔ (۱۰)

چہارم۔ پہلی آیت (ولا یحزنك الذین یسارعون فی الکفر انھم لن یضروا اللہ شیئا یرید اللہ الا یجعل لھم حظا فی الآخرۃ ولھم عذاب عظیم) تمام کفار کے بارے میں ہے اور دوسری آیت خاص طور پر منافقین کے بارے میں ہے۔ خاص طور پر ان کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ ان کا ضرر اور مکر وفریب عام کفار سے بڑھا ہوا ہے۔ (۱۱)

لیکن ابوسعود اس توجیہ سے مطمئن نہیں، وہ رقم طراز ہیں:

”پہلی آیت میں عام کفار مراد لینا، قرآن کریم کی عظمت کے شایانِ شان نہیں، اس لیے کہ

مذکورہ معنی میں ''مسارعت'' کا صدور اور اس کا نبی کریم ﷺ کے لیے باعثِ ملال ہونا (جیسا کہ ''نہی'' کے اسلوب سے اندازہ ہوتا ہے) تو ان کفار کی طرف سے متصور ہے، جن کے اندر ان اوصاف کا ہونا معلوم ہو، لیکن جو کفار دور دراز علاقوں میں رہتے ہیں، اور ان کے بارے میں کوئی علم نہیں، ان کی طرف مسارعت کی نسبت کرنا، اور اس کو آپ ﷺ کے لیے رنج وغم کے اسباب قرار دینا بلا وجہ ہے۔ (۱۲)

جب کہ آلوسی نے اس توجیہ کا دفاع کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ممکن ہے کہ جن لوگوں نے یہ توجیہ کی ہے، ان کے پیش نظر مسلمانوں کے مقابلہ میں عام کفار (خواہ وہ کہیں اور کسی حالت میں ہوں) مراد نہ ہوں؛ بلکہ وہ مرتدین اور متخلفین مراد ہوں، جن سے اندیشہ ہے کہ وہ آپ ﷺ کو ایذاء پہنچا سکتے ہیں۔ اس کے بعد یہ اعتراض نہیں رہتا۔ (۱۳)

۴۔فرمان باری

واذ أخذ اللّٰہ میثاق الذین أوتوا الکتاب لتبیننه للناس ولا تکتمونه فنبذوہ وراء ظهورهم واشتروا به ثمنا قلیلا، فبئس ما یشترون [آل عمران/۱۸۷]

''اور جب اللہ نے عہد لیا کتاب والوں سے کہ اس کو بیان کروگے، لوگوں سے، اور نہ چھپاؤ گے، پھر پھینک دیا انہوں نے وہ عہد اپنی پیٹھ کے پیچھے اور خرید لیا اس کے بدلے تھوڑا مول، سو کیا برا ہے وہ جو خریدتے ہیں''۔

سوال یہ ہے کہ ''بیان''، ''کتمان'' کی ضد ہے، جب بیان کا حکم دیا تو اس میں کتمان کی ممانعت بھی ہے۔ پھر الگ سے ''کتمان'' کی ممانعت کرنے میں کیا فائدہ ہے۔

اس کے دو جواب دیے گئے ہیں:

اول: ''بیان'' سے مراد توریت وانجیل میں رسول ﷺ کی نبوت کے جو دلائل ہیں، ان کو بیان کرنا ہے۔ اور ''کتمان'' سے مراد یہ ہے کہ ان میں غلط تاویلیں، اور باطل شبہات پیدا نہ کریں۔ یہ جواب رازی، ابوسعود، اور آلوسی نے لکھا ہے۔ (۱۴)

دوم: یہ ماسبق میں داخل ہے، مامور بہ کے ایجاب میں مبالغہ کے لیے اس کی تصریح کردی۔ یہ جواب ابوسعود اور آلوسی نے لکھا ہے۔ (۱۵)

۵۔فرمان باری

ان فی خلق السماوات والأرض واختلاف اللیل والنهار لآیات لأولی الألباب

[آل عمران/۱۹۰]

''بے شک آسمانوں اور زمین کا بنانا، رات دن کا آنا جانا اس میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لیے''۔

یہ آیت بعینہٖ انہی الفاظ کے ساتھ سورہ بقرہ [۱۶۴] میں آچکی ہے، پھر اس کو یہاں پر دوبارہ لانے میں کیا حکمت ہے؟

امام رازی نے یہ اور اس طرح کے دوسرے سوالات اٹھانے کے بعد ان کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے

''نقطۂ بصیرت، آنکھ کی پتلی کے قائم مقام ہے۔ جس طرح آنکھ کی پتلی ایک ساتھ دو چیزوں کا احاطہ نہیں کرسکتی، بلکہ جب وہ کسی ایک چیز کی طرف نظر جمائے تو اسی حالت میں کسی دوسری چیز کی طرف نظر نہیں جماسکتی، اسی طرح جب انسان اپنی بصیرت کی پتلی کو کسی عقلی و ذہنی چیز پر جمالے تو اسی حالت میں، کسی اور دوسری ذہنی چیز پر پتلی کو جمانا دشوار ہوتا ہے۔ بناء بریں، عقل، جس قدر مختلف معقولات کی طرف توجہ دینے میں مشغول ہوگی، ان معقولات، و ادراکات کے احاطہ سے محروم ہوگی۔ اسی لحاظ سے ایک سالک الی اللہ کے لیے ابتداء امر میں ضروری ہوتا ہے کہ وہ دلائل پر خوب توجہ دے، اور جب اس کا دل، معرفتِ الٰہی کے نور سے منور ہوجائے تو اب ان دلائل میں اس کا اشتغال، دل کے معرفتِ الٰہی میں استغراق سے حجاب کے مانند ہوجائے گا، تو ایک سالک ابتداء امر میں، تکثیر دلائل کا طالب تھا؛ لیکن جب اس کے دل میں یہ نور آگیا تو وہ تقلیل دلائل کا طالب ہوگیا۔ یہاں تک کہ جب غیر اللہ کے ساتھ دل کے اشتغال کی وجہ سے جو ظلمت و تاریکی پیدا ہوئی تھی، وہ دور ہوگئی، تو اس کے اندر معرفتِ الٰہی کی تجلی مکمل ہوگئی۔ اس آیت کریمہ میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

فاخلع نعليك انك بالوادی المقدس طوی [طہٰ/۱۲]

''سو اتار ڈال اپنی جوتیاں، تو ہے پاک میدان طویٰ میں''۔

''نعلین'' سے مراد وہ دو مقدمات ہیں، جن کے ذریعہ عقل، معرفتِ الٰہی تک پہنچتی ہے، اور جب وہ معرفتِ الٰہی تک پہنچ گئی تو اس کو اتار دینے کا حکم آیا۔ اور اس سے کہا گیا کہ تم وحدانیت کی مقدس وادی میں قدم رکھنا چاہتے ہو، تو دلائل کے ساتھ اشتغال چھوڑ دو۔

یہ قاعدہ سمجھ لینے کے بعد اب اصل مقصد پر آتے ہیں۔ سورہ بقرہ میں آٹھ طرح کے دلائل

بیان کیے، پھراس سورہ میں ان میں سے صرف تین قسم کے دلائل کا اعادہ کیا،اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ ایک ''عارف'' کے ''صاحبِ معرفت'' ہونے کے بعد،ضروری ہے کہ وہ دلائل کی طرف التفات کم کرے،تا کہ مدلول کی معرفت میں استغراق اس کے لیے مکمل ہو۔لہٰذا بقیہ دلائل کونظر انداز کر کے صرف تین طرح کے دلائل کے اعادہ سے مقصود،اسی سابقہ امر پر تنبیہ ہے۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان آسمانی دلائل کو استقصاء کے ساتھ بیان کیا،اور بقیہ پانچ (ارضی) دلائل کو نظر انداز فرمایا،اس لیے کہ آسمانی دلائل،زیادہ زبردست اور سخت حیران کن ہیں،اور ان میں عجائب بھی زیادہ ہیں۔اور ان کو دیکھ کر دل،اللہ کی عظمت اور کبریاء کی طرف زیادہ منتقل ہوتا ہے۔پھر سابقہ آیت کے اختتام پر فرمایا۔

لقوم یعقلون. ''ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں''

اور اِس آیت کے اختتام پر فرمایا:

لأولی الألباب ''لب والوں کے لیے''

اس لیے کہ عقل کا ایک ظاہر اور ایک ''مغز'' ہوتا ہے،شروع شروع میں اسے ''عقل'' کہتے ہیں،اور حالتِ کمال میں ''لب'' (مغز) کہتے ہیں۔اس سے بھی ہمارے دعوے کو تقویت ملتی ہے۔ہمارے ذہن کی رسائی یہیں تک ہے،اللہ کے حکیمانہ کریمانہ کلام کے اسرار کو وہی بہتر جان سکتا ہے۔(۱۶)

۶۔فرمانِ باری

ربنااننا سمعنا منادیا ینادی للایمان أن آمنوا بربکم فآمنا،ربنا فاغفر لنا ذنوبنا و کفرعناسیئاتنا و توفنا مع الأبرار[آل عمران/۱۹۳]

''اے رب ہمارے! ہم نے سنا ایک پکارنے والا،پکارتا ہے:ایمان لانے کو کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر سو ہم ایمان لے آئے اے ہمارے رب!اب ہمارے گناہ بخش دے،اور ہم سے برائیاں دور کر دے،اور ہم کو نیک لوگوں کے ساتھ موت دے''۔

اس آیت میں چند مقامات پر بدیہیات ہیں۔

مقام اول

منادی وہی کہلاتا ہے، جو ندا ء دے، پھر ''منادیا'' کے بعد ''ینادی'' کے اضافہ میں کیا حکمت ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً نداء کو مطلقاً ذکر کیا پھر ایمان کے ساتھ مقید کر کے ذکر کیا،اس کا

مقصد، منادی کی عظمتِ شان کو بیان کرنا ہے، اس لیے کہ ایمان کی ندا، دینے والے منادی سے بڑھ کر کوئی اور منادی نہیں ہوسکتا۔ اس کی نظیر ”مررت بهادیهدی للاسلام“ (ایسا راہ بر، جو اسلام کی راہ بری کررہا تھا)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر منادی کا لفظ مطلقا بولا جائے تو ذہن، جنگ کے منادی یا آگ بجھانے کی خاطر ندا، دینے والے، یا مصیبت کے مارے کی مدد کے لیے ندا، دینے والے، یا کسی ناگہانی آفت میں تعاون کے لیے ندا، دینے والے کی طرف جاتا ہے۔ اسی طرح ”ھادی“ (راہ بر) کا اطلاق، راستہ دکھانے والے پر، اور فکری رہ نمائی کرنے والے پر ہوتا ہے، لیکن جب اس کے بعد ”ینادی للایمان“ یا ”یھدی للاسلام“ کہہ دیا تو آپ نے منادی اور ”ہادی“ کی شان بڑھادی، اور اس کو اونچا اٹھادیا۔ یہ جواب: زمخشری، رازی، ابو حیان، ابوسعود، اور شوکانی نے نقل کیا ہے۔ (۱۷)

مقام دوم

مغفرت اور تکفیر ہم معنی ہیں، پھر دونوں کو ایک ساتھ لانے میں کیا حکمت ہے؟

اس کے کئی جواب دیے گئے ہیں:

۱۔ ان دونوں سے مراد ایک ہے، البتہ تاکید کے لیے دوبارہ ذکر کردیا گیا، اس لیے کہ دعا، میں الحاح وزاری مستحب ہے۔ یہ جواب: رازی، ابوحیان، اور ابن عاشور نے دیا ہے۔ (۱۸)

۲۔ اول الذکر سے مراد سابقہ گناہ، اور موخر الذکر سے مراد نئے اور بعد کے گناہ ہیں۔ یہ جواب رازی نے دیا ہے۔ (۱۹)

۳۔ مغفرت سے مراد وہ گناہ ہیں جو توبہ سے معاف ہوجاتے ہیں، اور تکفیر سے مراد وہ گناہ ہیں، جو کسی بڑی نیکی سے ہی معاف ہوتے ہیں۔ یہ جواب رازی نے دیا ہے۔ (۲۰)

۴۔ غفران اور تکفیر مادہ اشتقاق کے لحاظ سے قریب قریب ہیں، البتہ غفر اور غفران کا استعمال، گناہ سے معافی میں عام ہے، اور تکفیر کا استعمال گناہ کے بدلہ کوئی دوسرا کام کردینے کے معنی میں ہے، گویا اس کے عوض اور بدلہ نے اس گناہ کو چھپادیا، اور اسی وجہ سے رمضان میں روزہ نہ رکھنے کے عوض کو کفارہ، اور قسم توڑنے کے عوض کو کفارہ کہتے ہیں۔ یہاں پر ذنوب“ سے مراد وہ گناہ ہیں جو ان کی ذات تک محدود ہیں، اسی لیے انھوں نے ان کی مغفرت کی درخواست کی اور ”سیئات“ سے مراد وہ گناہ ہیں، جن میں دوسروں کا حق ہے، اسی لیے انھوں نے ان کی تکفیر کی درخواست کی۔ یہ جواب: ابن عاشور، ابوحیان، اور آلوسی نے دیا ہے۔ (۲۱)

مقام سوم

''ذنوب'' اور ''سیئات'' ایک ہے، پھر اس تکرار کا کیا فائدہ ہے؟

اس کے کئی فائدے بیان کئے گئے ہیں:

۱۔ ''ذنوب'' سے مراد گناہِ کبیرہ اور ''سیئات'' سے مراد گناہِ صغیرہ ہیں، اس کی تائید اس فرمانِ باری سے ہوتی ہے:

ان تجتنبوا کبائرماتنهون عنه نکفرعنکم سیئاتکم و ندخلکم مدخلا کریما [نساء/۳۱]

''جن کاموں سے تم کو منع کیا جاتا ہے، ان میں جو بھاری بھاری کام ہیں، اگر تم ان سے بچتے رہو تو ہم تمھاری خفیف برائیاں تم سے دور کردیں گے، اور ہم تم کو ایک معزز جگہ میں داخل کردیں گے''۔

یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے، اس کی تائید میں انہوں نے یہ دلیل دی کہ اس میں لغوی مناسبت ہے، کیوں کہ ''ذنوب''، ''ذنب'' بمعنی دم سے ماخوذ ہے، لہٰذا اس کا استعمال ایسی چیز کے لیے ہوا جس کا انجام برا ہو، اور وہ گناہِ کبیرہ ہے، کیوں کہ اس کے نتیجہ میں بڑا گناہ ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کو ''تبعۃ'' (انجام) کہتے ہیں کہ اس کے پیچھے سزا ہوتی ہے، راغب نے اس کی تصریح کی ہے۔ جب کہ ''سیئات''، کا ماخذ، ''سوء'' ہے، جس کے معنی قبیح چیز ہے، اسی وجہ سے یہ ''حسنة'' کے مقابلہ میں آتا ہے، لہٰذا یہ اول الذکر کے بہ نسبت اخف ہے۔ یہ فائدہ زمخشری، ابوحیان، ابوسعود، اور آلوسی نے بیان کیا ہے۔ (۲۲)

۲۔ اول الذکر سے مراد وہ گناہ ہیں، جن کو انسان معصیت اور گناہ سمجھ کر کرتا ہے، اور موخرالذکر سے مراد وہ گناہ ہیں، جن کے ارتکاب کے وقت آدمی، ان کو گناہ اور معصیت نہیں سمجھتا۔ یہ جواب بھی رازی نے دیا ہے۔ (۲۳)

۳۔ ذنوب سے مراد سابقہ معاصی، اور سیئات سے مراد بعد کے گناہ ہیں۔ یہ فائدہ آلوسی نے بیان کیا ہے۔ (۲۴)

۴۔ ذنوب سے مراد: نیک کام نہ کرنا، اور سیئات سے مراد، برائی کرنا۔ یہ فائدہ ابوحیان نے لکھا ہے۔ (۲۵)

۵۔ ذنوب اور سیئات ہم معنی ہیں، تاکید اور مبالغہ کے لیے مکرر ذکر کردیا گیا، تاکہ دعاء میں الحاح وزاری ہو، اس لیے کہ حدیث میں ہے۔

ان الله يحب الملحين فى الدعاء(۲۶)

''دعاء میں الحاء وزاری کرنے والوں کو، اللہ تعالی پسند کرتا ہے''۔

یہ فائدہ ابوحیان نے لکھا ہے۔(۲۷)

۷۔فرمانِ باری

ربناو آتنا ما وعدتنا على رسلك ولا تخزنا يوم القيامة،انك لاتخلف الميعاد

[آل عمران/۱۹۴]

''اے ہمارے رب! دے ہم کو جو وعدہ کیا تو نے ہم سے، رسولوں کے واسطے سے اور رسوا نہ کر ہم کو قیامت کے دن، بے شک تو وعدہ خلاف نہیں کرتا۔

اس آیت میں دو مقام پر بدیہیات ہیں:

مقام اول

یہ بدیہی ہے کہ اللہ تعالی کے یہاں وعدہ خلافی محال ہے، پھر جو چیز لامحالہ ہونے والی ہے، دعاء کے ذریعہ اس کو مانگنے میں کیا حکمت ہے؟

اس اشکال کے کئی جواب دیے گئے ہیں:

۱۔دعاء کا مقصد اس کو انجام دینے کی درخواست کرنا نہیں، بلکہ اس کا مقصد، خشوع، خضوع اور ذلت وعبودیت کا اظہار ہے، ہمیں ایسی چیزوں کی دعاء مانگنے کا حکم دیا گیا ہے، جس کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ لامحالہ واقع ہوں گی، جیسے قل رب احكم بالحق[انبیاء/۱۱۲] ''پیغمبر نے کہا: اے میرے رب! فیصلہ کر دیجیے حق کے موافق''۔

نیز

فاغفر للذين تابوا واتبعوا سبيلك [غافر/۷]

''سو ان لوگوں کو بخش دیجیے، جنھوں نے توبہ کی، اور آپ کے رستہ پر چلے''۔

یہ جواب: رازی، ابوحیان، ابوسعود، آلوسی، اور ابن عاشور نے بیان کیا ہے۔(۲۸)

۲۔وعدۂ الٰہی، امت کے کسی معین فرد کو شامل نہیں، بلکہ ان کے اوصاف کے لحاظ سے ان کو شامل ہے، اس لیے کہ اللہ تعالی نے متقیوں کے لیے ثواب کا وعدہ کیا اور فاسقوں کو سزا دینے کا وعدہ فرمایا ہے، اب ''وآتنا ما وعدتنا'' کا معنی یہ ہے کہ خدایا! ہمیں ایسے اعمال کی توفیق دے، جن کو انجام دے کر ہم تیرے وعدے کے اہل و مستحق بن جائیں، اور ہمیں ایسے اعمال سے

دور رکھ، جن کی نحوست سے ہم، سزا اور رسوائی کے مستحق ٹھہریں۔ اس توجیہ کی صورت میں آیت کا مقصد، نیکی کی توفیق اور معصیت سے حفاظت کی درخواست کرنا ہے۔ یہ جواب: زمخشری، رازی، ابوحیان، ابوسعود، آلوسی، اور ابن عاشور نے بیان کیا ہے۔(۲۹)

۳۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان سے وعدہ فرمایا کہ دنیا میں ان کی نصرت کرے گا، اوران کے دشمنوں کو مغلوب کرے گا، اس دعاء کے ذریعہ وہ اس وعدہ کو جلد پورا کرنے کی درخواست کررہے ہیں۔ اس توجیہ کے بعد اعتراض نہیں رہتا۔ یہ جواب: طبری، رازی، اور آلوسی نے بیان کیا ہے۔(۳۰)

ابن عاشور نے یہ جواب نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس کی نظیر حضرت خبابؓ بن ارت کا یہ مقولہ ہے۔

''ہم نے رضاءِ الٰہی کی خاطر، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہجرت کی، اس لیے ہمارا اجر اللہ کے ذمہ ہوگیا، پھر کچھ لوگ تو وہ ہیں، جن کا پھل پک گیا اور وہ اس میں سے توڑ رہے ہیں، اور ہم میں سے کچھ لوگ وہ ہیں، جو اپنا صلہ حاصل کیے بغیر دنیا سے چلے، انہی لوگوں میں سے حضرت مصعب بن عمیرؓ ہیں، غزوۂ احد میں ان کی شہادت ہوگئی تو ہمارے پاس اتنا کپڑا بھی میسر نہ تھا، جس میں ان کو کفن دے سکیں۔(۳۱)

۴۔ ابوحیان لکھتے ہیں کہ قرافی نے فرق (۲۷۳) میں لکھا ہے:

''انہوں نے اس کی درخواست اس لیے کی کہ اس کا حصول ایمان پر وفات کے ساتھ مشروط ہے، اس کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ انہوں نے اس سے پہلے کہا تھا: وتوفنا مع الابرار''۔

لیکن اس جواب کی بنیاد پر، وعدۂ خداوندی کو، آخرت کے ثواب میں منحصر کرنا ہوگا۔ اور چوں کہ آخرت کے دن، رسوائی نہایت سخت ہوگی، اس لیے انہوں نے اس سے نجات کی درخواست دوبارہ کی۔(۳۲)

۵۔ انہوں نے اس کی درخواست اس لیے کی کہ اس کا حصول، ان اعمال کی قبولیت کی نشانی ہے، جن پر اللہ کا وعدہ قائم ہے۔ کیوں کہ وہ ایسے اعمال تو کرتے ہیں، جن سے اس درجہ تک پہنچ سکتے ہیں، لیکن یہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ نیک اعمال کے ساتھ ایسے اعمال بھی ہوگئے ہیں، جو اس کو ضائع کردیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ (وآتنا ما وعدتنا) میں ''فاء'' کے بجائے ''واؤ'' کا استعمال کیا، کیوں کہ انہوں نے اس کو ایک مستقل دعاء بنائی، تاکہ اس کے پورا ہونے پر اس کے اسباب بھی

پورے ہوں، اور اس کو انہوں، کسی ایسے فعل کا نتیجہ قرار نہیں دیا، جو قطعی الحصول ہو، اس توجیہ کی صحت کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد فرمایا

فاستجاب لهم ربهم انی لا اضیع عمل عامل منكم [آل عمران/۱۹۵]

''پھر قبول کی ان کی دعا، ان کے رب نے، کہ میں ضائع نہیں کرتا محنت کسی محنت کرنے والے کی''۔

حالاں کہ انہوں نے یہاں پر، اپنے اعمال کے ضائع نہ کرنے کی درخواست نہیں کی۔ یہ جواب ابوحیان نے لکھا ہے۔(۳۳)

مقام دوم

یہ بدیہی بات ہے کہ جب ثواب مل جائے گا تو عقاب وسزا لازمی طور پر ٹل جائے گی۔ (ربناوآتنا ما وعدتنا علی رسلك) میں ثواب کا مطالبہ تھا، اس کے بعد (ولا تخزنا یوم القیامة) میں ترک عقاب کے مطالبہ کی کیا وجہ ہوسکتی ہے، ہاں اگر پہلے ترک عقاب کا مطالبہ ہوتا پھر ثواب کا، تو بات درست تھی؟

اس کی کئی توجیہات کی گئی ہیں:

۱۔ثواب کی شرط یہ ہے کہ وہ ایسا نفع ہو جس میں تعظیم وسرور ساتھ ساتھ ہو، (ربناوآتنا) سے مراد منافع ہیں، اور (ولا تخزنا) سے مراد تعظیم ہے۔ یہ جواب رازی اور آلوسی نے لکھا ہے۔(۳۴)

۲۔اس آیت کا مقصد، نیکی کی توفیق، اور معصیت سے بچنے کی درخواست ہے، اس لحاظ سے یہ عبارت مناسب ہے، گویا یوں کہا گیا کہ ہمیں نیکیوں کی توفیق دے، اور جب آپ نے ہمیں اس کی توفیق دے دی تو ہمیں ہر ایسے عمل سے بچا جو اس کو اکارت اور ضائع کردے، اور ہمیں رسوائی اور ہلاکت میں ڈال دے۔ حاصل یہ ہے کہ گویا یوں کہا گیا کہ ہمیں اپنی فرماں برداری کی توفیق دے، اس لیے کہ تیری توفیق کے بغیر ہم کوئی نیکی نہیں کرسکتے، اور جب آپ نے ہمیں اس کی توفیق دے دی تو ہمیں یہ بھی توفیق دے کہ ہم اس کو قائم اور دائم رکھیں، اس لیے کہ تیری توفیق کے بغیر ہم اس کو قائم اور باقی نہیں رکھ سکتے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ بندہ کوئی عمل، کوئی فعل، کوئی حرکت وسکون، اللہ کی اعانت اور توفیق کے بغیر نہیں کرسکتا۔ یہ جواب رازی نے لکھا ہے۔(۳۵)

۳۔انہوں نے اولاً ثواب کا مطالبہ کیا کہ اس سے عذاب جسمانی ٹل جاتا ہے۔ پھر روحانی عذاب کے ٹالنے کا مطالبہ کیا اس لیے کہ ''خزی'' سے مراد اہانت انگیزی اور شرمندہ کرنا ہے۔ اور

اس کلام میں ادنی سے اعلی کی طرف ترقی کرنا ہے، گویا انہوں نے یوں کہا کہ پروردگار! ہم سے جسمانی عذاب ہٹادے، اور وہ روحانی عذاب بھی ہٹادے، جو اس جسمانی عذاب سے سخت اور بھیانک ہے۔ یہ جواب آلوسی نے لکھا ہے۔ (۳۶)

۴۔ اول اس سے مراد، دنیا میں نصرت کی دعاء کرنا ہے، اور اس صورت میں، صرف ایک کا ذکرنا کافی ہونا ظاہر ہے، دونوں کا تذکرہ ضروری ہے، بلکہ دونوں طرح کی دعائیں کرنے میں ایک لطیف اشارہ ہے، اس لیے کہ پہلی دعاء کا حاصل یہ ہے کہ ہم پر دشمن کو غلبہ دے کر، ہمیں دنیا میں رسوا نہ کر، گویا انہوں نے یہ دعاء مانگی کہ خدایا! ہمیں دنیا میں رسوا کر، نہ آخرت میں۔ البتہ اس کی تعبیر الگ الگ انداز سے کی، اور چوں کہ دونوں مقاصد الگ الگ تھے، اس لیے ہر ایک کے لیے علاحدہ اسلوب اختیار کیا۔ یہ جواب آلوسی نے لکھا ہے۔ (۳۷)

اختتام سورہ آل عمران

آغاز سورہ نساء

۱۔ فرمان باری

یاایها الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدة وخلق منها زوجها و بث منهما رجالا کثیرا ونساء ،واتقوا اللّٰه الذی تساء لون به والأرحام ، ان اللّٰه کان علیکم رقیبا [نساء/۱]

”اے لوگو! ڈرتے رہو اپنے رب سے، جس نے پیدا کیا تم کو ایک جان سے، اور اسی نے پیدا کیا اس کا جوڑا اور پھیلائے ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں اور ڈرتے رہو اللہ سے جس کے واسطہ سے سوال کرتے ہو، آپس میں، خبردار رہو قرابت والوں سے، بے شک اللہ تم پر نگہبان ہے“۔

اس آیت میں چند مقام پر بدیہیات ہیں

مقام اول

اس آیت میں پہلے فرمایا (اتقوا ربکم) اس کے بعد پھر فرمایا (واتقوا اللہ)، اس تکرار کا کیا فائدہ ہے؟

اس تکرار کے کئی فائدے بیان کیے گئے ہیں:

۱۔ اس میں امر سابق کی تاکید اور اس پر ابھارنا ہے، جیسے آپ کہتے ہیں: اعجل ، اعجل (جلدی کرو، جلدی کرو) اور اس میں صرف ایک بار : اعجل (جلدی کرو) کہنے سے زیادہ مبالغہ

رکھتا ہے۔ یہ فائدہ رازی، ابوحیان، قرطبی، اور آلوسی نے بیان کیا ہے۔(۳۸)

۲۔تقوے کا پہلا حکم اس لیے دیا کہ وہاں تخلیق وغیرہ کا انعام مذکور ہے، اور دوبارہ تقوے کا حکم اس لیے دیا کہ لوگ جب ایک دوسرے سے کوئی سوال کرتے ہیں تو اللہ کا ہی حوالہ دے کر مانگتے ہیں۔ یہ فائدہ رازی اور ابوحیان نے بیان کیا ہے۔(۳۹)

یہی فائدہ ابوسعود بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''(واتقوا اللہ الذی تساء لون بہ) میں تقوے کا حکم دوبارہ آیا ہے، اور اس میں اللہ تعالی کی فرماں برداری کے تقاضوں میں سے ایک اور تقاضے کو یاد دلایا گیا ہے، اس لیے کہ لوگ جب اللہ کے حوالے سے ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ کے واسطے میں یہ چاہتا ہوں، تو اس کا تقاضا ہے کہ اللہ کے اوامر ونواہی کی خلاف ورزی سے ڈرا جائے، اور اس میں ضمیر کے بجائے، صراحتاً لفظ ''اللہ'' کے ساتھ تقوے کو متعلق کرنے میں، اللہ کی اطاعت پر آمادہ کرنے کی مزید تاکید ومبالغہ ہے، اور اس سے اللہ کی ہیبت ورعب ودبدبہ قائم ہونے کی تربیت دینا مقصود ہے، نیز اس لیے بھی کہ ایک دوسرے سے سوال کرنے میں لوگ لفظ ''اللہ'' کا سہارا لیتے ہیں، اللہ تعالی کے کسی دوسرے اسم یا صفت کا ذکر نہیں کرتے۔''(۴۰)

۳۔آیت میں پہلے فرمایا (اتقوا ربکم) اس کے بعد (واتقوا اللہ) فرمایا۔ لفظ ''رب'' سے تربیت اور احسان کا معنی نکلتا ہے، اور لفظ ''اللہ'' قہر وہیبت پر دلالت کرتا ہے، اس لیے پہلے ترغیب کے طور پر تقوی کا حکم دیا پھر ترہیب کے طور پر تقوی کا حکم دیا۔ جیسا کہ اس فرمان باری میں ہے

یدعون ربھم خوفا وطمعا [سجدہ/۱۶]

''اپنے رب کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں''۔

نیز فرمایا:

یدعوننا رغبا ورھبا [انبیاء/۹۰]

''امید وبیم کے ساتھ ہماری عبادت کیا کرتے تھے''۔

گویا یوں کہا گیا کہ اس ذات نے تمہاری تربیت فرمائی، لہٰذا اس کی خلاف ورزی سے ڈرو، اس لیے کہ وہ سخت عذاب والا، اور زبردست سطوت والا ہے۔ یہ فائدہ امام رازی نے بیان کیا ہے۔(۴۱)

۴۔فعل ''اتقوا'' دوبارہ اس لیے ذکر کیا گیا کہ اس تقوے کا حکم صرف مسلمانوں کو ہے، کیوں کہ ان کے اندر غیر شعوری طور پر جاہلیت کی بعض عادات (مثلاً رشتہ داروں اور یتیموں کے حقوق

میں تساہل) باقی رہ گئی تھیں۔ یہ فائدہ ابن عاشور نے بیان کیا ہے۔(۴۲)

مقام دوم

یہاں پر''خلق''، **فعل** دوبارذکرکیا گیا، حالاں کہ دوسرے **فعل** کے مفعول کا، پہلے **فعل** کے مفعول پرعطف ہوسکتا تھا، اوراس طرح تکرار سے بچا جاسکتا ہے، پھراس میں کیا حکمت ہے؟

ابوسعوداس کا جواب دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''دوسرے **فعل** کے مفعول، کا پہلے **فعل** کے مفعول پرعطف ممکن تھا، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ہے

یاایھا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم ..[بقرہ/۲۱]

''اے لوگو! اپنے رب کی عبادت اختیار کرو، جس نے تم کو پیدا کیا اوران لوگوں کو بھی، جو تم سے پہلے گزر چکے''۔

اس کے باوجود، **فعل** کو دوبارہ لانے کا مقصد، دونوں تخلیقوں میں جوفرق ہے، اس کو بیان کرنا ہے۔اس لیے کہ پہلی تخلیق، اصل سے تفریع کے طور پر ہے، اوردوسری تخلیق، بذاتِ خود مادہ سے وجود میں لانے کے طور پر ہے، کیوں کہ اللہ تعالی نے حضرت حوا، کوحضرت آدم کی پسلی سے پیدافرمایا۔(۴۳)

حواشی

(۱) رازی ۴/۳۷۴۔
(۲) رازی ۴/۳۷۴۔
(۳) رازی ۴/۳۷۴، ابوسعود ۲/۱۵، آلوسی ۴/۱۲۳، شوکانی تفسیر آیت؛ ابوحیان تفسیر آیت۔
(۴) زمخشری تفسیرِ آیت۔
(۵) ابن عطیہ ۲/۴۴؛ ابوسعود ۲/۱۵؛ آلوسی ۴/۱۲۳، شوکانی تفسیر آیت؛ ابوحیان تفسیر آیت۔
(۶) آلوسی ۴/۱۲۳۔
(۷) زمخشری تفسر آیت۔
(۸) زمخشری تفسیرِ آیت، ابوحیان تفسیرِ آیت، ابوسعود ۲/۱۲۰، آلوسی ۴/۱۳۴؛ شوکانی تفسیرِ آیت۔
(۹) رازی ۴/۴۸۳۔
(۱۰) زمخشری تفسیرِ آیت، ابوحیان تفسیرِ آیت، ابوسعود ۲/۱۲۰، آلوسی ۴/۱۳۴؛ شوکانی تفسیرِ آیت۔
(۱۱) زمخشری تفسیرِ آیت۔

(۱۲) ابوسعود۲/۱۲۰، آلوسی۴/۱۳۴۔

(۱۳) آلوسی۴/۱۳۴۔

(۱۴) رازی۵/۵، ابوسعود۲/۱۲۶، آلوسی۴/۱۴۹۔

(۱۵) ابوسعود۲/۱۲۶، آلوسی۴/۱۴۹۔

(۱۶) رازی۵/۹۔

(۱۷) زمخشری تفسیرِ آیت، رازی۵/۱۹، ابوحیان تفسیر آیت، ابوسعود۲/۱۳۴، شوکانی تفسیرِ آیت۔

(۱۸) رازی۵/۱۹، ابوحیان تفسیر آیت؛ ابن عاشور تفسیر آیت۔

(۱۹) رازی۵/۱۹۔

(۲۰) رازی۵/۱۹۔

(۲۱) ابن عاشور۳/۳۰۵؛؛ ابوحیان۳/۴۹۵؛ آلوسی۴/۱۶۶۔

(۲۲) زمخشری تفسیرِ آیت، ابوحیان تفسیرِ آیت، ابوسعود۲/۱۳۴، اور آلوسی۴/۱۶۶۔

(۲۳) رازی۵/۱۹؛ آلوسی۴/۱۶۶۔

(۲۴) آلوسی۴/۱۶۶۔

(۲۵) ابوحیان۳/۴۹۵۔

(۲۶) شعب الایمان از بیہقی ۳/۱۶۷[۱۱۲۰] بروایت حضرت عائشہؓ میں روایت کے الفاظ یہ ہیں: ان اللّٰہ لیحب الملحین فی الدعاء۔

(۲۷) ابوحیان۳/۴۹۵۔

(۲۸) رازی۵/۲۲، ابوحیان تفسیرِ آیت، ابوسعود۲/۱۳۵، آلوسی۴/۱۷۶، ابن عاشور تفسیرِ آیت۔

(۲۹) زمخشری تفسیر آیت؛ رازی۵/۲۲، ابوحیان تفسیرِ آیت، ابوسعود۲/۱۳۵، آلوسی۴/۱۷۶، ابن عاشور تفسیرِ آیت۔

(۳۰) طبری۴/۱۴۲، رازی۹/۴۶۹، آلوسی۴/۱۷۶۔

(۳۱) ابن عاشور۳/۳۰۷۔

(۳۲) ابوحیان تفسیرِ آیت۔

(۳۳) ابوحیان تفسیرِ آیت۔

(۳۴) رازی۹/۴۶۸؛ آلوسی۴/۱۶۶۔

(۳۵) رازی۹/۴۶۸۔

(۳۶) آلوسی۴/۱۶۶۔

(۳۷) آلوسی۴/۱۶۶۔

(۳۸) رازی تفسیرِ آیت، ابوحیان تفسیرِ آیت، قرطبی۵/۱۳۹، آلوسی۳/۱۸۵۔

(۳۹) رازی تفسیرِ آیت، ابوحیان تفسیرِ آیت۔

(۴۰) ابوسعود۲/۱۳۹۔

(۴۱) رازی تفسیر آیت۔

(۴۲) ابن عاشور۳/۳۱۔

(۴۳) ابوسعود۲/۱۳۹۔

❁ ❁ ❁

تری عظمت کے مقابل مرا سجدہ کیا ہے....!

از: عزیز بلگامی

سائنس کو اِس بات کا اعتراف ہے کہ کائنات کا ننانوے فی صد سے بھی زائد مادہ یا Matter نہ ضبطِ جستجو ہی میں آسکا ہے اور نہ کسی طاقتور دوربین کی نگاہ میں سما ہی سکا ہے۔ اِس ترقی یافتہ دور کے Cosmologists کا بیان ہے کہ جس قدر کائنات انسانی ادراک کے احاطے میں آچکی ہے اُس کا مادہ دیگر نامعلوم کائناتوں میں موجود مادّے کا ایک ادنیٰ سا حصہ ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ فضائے بسیط میں تیرنے والی کہکشائیں، اِس بنا پر گم نہیں ہو پاتیں کہ یہ دوسری کہکشاؤں یا کا سمک مادوں سے کسی قوت کے ذریعہ بندھی ہوئی ہیں۔ Big Bang Theory کہتی ہے کہ انتہائی کثیف اور انتہائی گرم کائنات ابتداء میں ایک جان یا Compact شکل میں تھی۔ پھر ایک زبردست کا سمک Cosmic دھماکہ نے ایک ایسی صورتحال پیدا کردی کہ کائنات کے پھیلنے کے عمل کا آغاز ہوگیا اور یہ تسلسل کے ساتھ ہر لمحہ جاری ہے۔ 1915ء میں مشہور سائنسدان البرٹ آئنس ٹائن نے Theory of Relativity پیش کی تھی اور اِسی تھیوری کی بنیاد پر اس Big Bang Theory کی صورت گری ہوئی تھی۔ اکیسویں صدی میں، جسے سائنسی دھماکوں کی صدی بھی کہا جاتا ہے، جس دھماکہ خیز واقعہ کی بظاہر انسانوں کو خبر ہوئی، چودہ سو سال پہلے، جب کہ اُس وقت جدید سائنس کا جنم بھی نہیں ہوا تھا، ربِّ کائنات نے اپنی آخری کتاب میں کیا اس کا تذکرہ نہیں کردیا تھا؟ اکیسویں سورۃ ''الانبیاء'' کی تیسویں آیت میں نہایت واضح الفاظ یہ ہیں: ''حقائق کا انکار کرنے والے انسان کیا اتنا غور نہیں کرتے کہ آسمان اور زمین اور ساری چیزیں ایک ہی واحد یونٹ کی طرح تھیں، پھر ہم نے انہیں یکبارگی ہی جدا جدا کردیا اور ہم نے مائع (پانی) سے ہر شے میں حیات ڈالی، تو کیا پھر بھی انہیں ماننا نہیں ہے؟''

پتہ نہیں کتنے کروڑوں سال قبل یہ واقعہ رونما ہوا ہوگا! تاہم چودہ سو سال قبل اِس حقیقت کی

خبر کے پیچھے رب تعالیٰ کی یہی مشیت کارفرما نظر آتی ہے کہ آسمانی کتاب کے ذریعہ انسانوں پر یہ حقیقت کھول دی جائے تا کہ دنیا سائنسی دریافتوں اور اکتشافات کی راہ میں ترقی کرتی چلی جائے۔ لیکن افسوس کہ انسان پھر بھی بات کو سمجھ نہیں پائے۔ یہاں تک کہ یہ آیت عصرِ حاضر کے انسانوں کے لئے ایک برمحل شہادت بن کر سامنے آئی اور یہ حقیقت اظہر من الشّمس ہوگئی کہ یہ کتاب کسی انسانی کاوشِ فکر ونظر کا نتیجہ نہیں ہے۔ اگر چہ کہ خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمادیا تھا کہ یہ کتاب رب تعالیٰ کی نازل کردہ ہے اور یہ کوئی انسانی تصنیف نہیں، جسکا ذکر چھبیسویں سورۃ الشعراء کی آیات ۱۹۲ تا ۱۹۵ میں فرمائی۔ ''اور اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم بیشک یہ قرآن رب العالمین کی طرف سے آپ کے قلب مبارک پر اُتارا گیا ہے، جسے جبریل روح الامین لیکر اُترے ہیں، تا کہ آپ ساری انسانیت کو وارننگ دیدیں، یہ صاف، شستہ، آسان عربی زبان میں ہے۔'' اس پر مستزاد یہ کہ اٹھائیسویں سورۃ کی آیت چھیاسی میں فرمایا: ''اور اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ تو اس کے امیدوار بھی نہ تھے کہ آپؐ پر آسمانی وحی اتاری جاتی، یہ تو سراسر رحمت ہے آپؐ کے رب کی۔'' اور یہ بھی صاف صاف اعلان کروایا کہ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰی اِلَیَّ ''میں تو صرف اسی کی اتباع کرتا ہوں جس کی وحی مجھ پر رب العالمین کی طرف سے آتی ہے۔''

قرآن حکیم اُسی باعظمت رب ہی کی تو کتاب ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو ایک ہی لفظ ''کُن'' سے پیدا فرمادیا۔ وہی ربِّ ذوالجلال ہی تو ہے جو اِس بے پناہ کائنات کے ایک ایک ذرّے کا نہ صرف خالق ہے بلکہ وہ اُس کی نگہبانی بھی کررہا ہے۔ وہ انسان جو اکتشافات پر اِتراتے نہیں تھکتا، اُسے چاہیے کہ کائنات میں اپنی حیثیت کا ادراک اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرلے۔ وہ انسان جن کے دامن میں کتاب اللہ کا نور سمٹ آیا ہے، اُن پر بڑی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ خاموش بیٹھنے کا تصور تک نہ کریں، بلکہ پیغامِ کتاب اللہ کی ترسیل کو پوری امانت داری کے ساتھ اپنے سرلیں اور دنیا کے بے نور سینوں کو منور کرتے ہوئے خود اپنی زندگیوں کو بھی منور کرلیں۔

سائنس کے بے خدا علمبردار اگر کتابِ الٰہی کی طرف رجوع کرتے ہیں تو یقینی ہے کہ سائنسی اکتشافات کی رفتار تیز تر بھی ہوجائے گی اور اخلاقی ضابطوں میں بندھ کر یہ ترقی روحانی قدروں سے مزیّن بھی ہو جائے گی اور جن تباہ کارو مہلک ہتھیاروں کی دوڑ میں یہ بے خدا سائنسدان دنیا کے قائدین کو اُلجھا رکھا ہے اور کاروبار کی نام ونہاد نفع بخشی کے خوابوں کو ان کی بے

نور آنکھوں میں سجادیا ہے، اگر یہ چاہیں تو اِن ہی ترقیوں کو سسکتی، بلکتی انسانیت کے زخموں کا مداوا بنا سکتے ہیں۔

مادہ ہو یا مائع، ہوا ہو یا لوہے کی مانند سخت منرلس، گیسیں ہوں یا ٹھوس اشیاء، نظروں کی گرفت میں آنے والا آسمان ہو یا نہ نظر آنے والی کائنات، غرض کہ ہر شئے نے اُسی مالک کے ہاتھوں اپنے وجود کا جامہ پہنا ہے، جس نے نہ صرف کائنات بنادی، بلکہ ''کل یوم ھو فی شان'' والی آن بان کے ساتھ ہر لمحہ اسکے تخلیقی کارناموں کا سلسلہ جاری ہے۔ پھر یہ کہ رب تعالی نے کائنات کو ایک بار وجود عطا کرکے بس یوں ہی چھوڑ نہیں دیا ہے بلکہ اسے مسلسل وسعت بھی دیئے جارہا ہے۔ جیسا کہ اکاونویں سورت کی سینتالیسویں آیت میں درج ہے: ''اور آسمان کو ہم ہی نے اپنے دستِ قدرت سے بنایا ہے اور ہم وسعت دیئے ہی جاتے ہیں۔''

خلائی سائنس کے محققین کا حال یہ ہے کہ وہ ثبوت کے نام پر دنیا کے سامنے اب تفصیلات پیش کررہے ہیں کہ یہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے جبکہ اِس ثبوت کے فراہم کیے جانے کے چودہ صدیوں قبل ہی ربِ کائنات نے یہ معلومات اپنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی ہی کتاب میں نازل فرمادی تھیں۔ اِس لیے دعویٰ ثبوت کے بجائے مقام عبرت سمجھتے ہوئے مالک کائنات کی قوتوں اور طاقتوں کا اعتراف ہونا چاہیے، بے بضاعتی وانکساری کی کیفیت اُبھرنی چاہیے، جملہ انسانوں کے تئیں فکرمندی اور انصاف پسندی کے جذبات مستحکم ہونے چاہئیں، ظلم وزیادتی کے سد باب کے ساتھ انسانی فلاح وبقا کی فکرمقدم رہنی چاہیے، اور جو افراد خود کو حاملین قرآن کہتے ہیں انہیں خوابِ غفلت سے بیدار ہوکر کم ازکم اب تو سوچنا چاہئے کہ دنیا کی سائنسی امامت تو دور کی بات ہے، آخر کیا بات ہے کہ اِس میدان میں آخری صف میں بھی انہیں کوئی مقام کیوں حاصل نہیں! کہیں ایسا تو نہیں کہ کتاب اللہ کو اسکے جائز وقار اور اِس کی عظمت کو اہمیت نہیں دی گئی، جیسا کہ اِس کا حق تھا!!

ویسے بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ سائنسی نظریات بدلتے رہتے ہیں اور اِن ہی تبدیلیوں کے حوالے سے ارتقاء بھی ہوتا رہتا ہے۔ Big Bang Theory کا پیش کیا جانا ہی ایسے ارتقاء کا ایک ثبوت ہے جس کے ذریعہ یہ حقیقت جاں گزیں ہوجاتی ہے کہ رب کائنات ہی قوت وحشمت کا سرچشمہ ہے کہ جو ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ایک ہی دھماکے کے ذریعہ اتنی عظیم کائنات کو وجود میں لاسکتا ہے اور اُسی کو یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ صور میں ایک ہی پھونک کے ذریعہ اس

پوری کائنات کو ختم بھی کردے؟ ہمیں پتہ بھی نہیں کہ کتنے کروڑوں سالوں پہلے یہ BangBig والا واقعہ ظہور پذیر ہوا ہوگا؟ ضروری بھی نہیں کہ اِس کا ہمیں پتہ ہو۔ہاں! البتہ ہمیں فکر ہونی چاہیے کہ کب صور میں پھونک دیا جائے گا کہ جس کے نتیجہ میں کب، کس لمحہ ساری کی ساری کائنات لپیٹ کر پھینک دی جائے گی!

یہ خبر تو ہمیں ہے ہی کہ کچھ قوتیں ہیں، جیسے کشش ثقل، برقی قوت، مقناطیسی اور نیوکلیائی قوتیں، جو ہمارے اطراف کارفرما ہیں، جن کی تخلیق ایک زبردست قوتوں والے رب ہی کے دستِ قدرت سے ممکن ہوئی ہے اور اُسی ربِّ باحشمت نے ان ساری طاقتوں کو پھیلا دیا ہے۔ نظریہ کہتا ہے کہ Big Bang کے معاً بعد اگلے ہی لمحے پروٹون تیار ہوئے، پھر فوراً ہی پروٹون اور نیوٹران کے باہمی ملاپ سے مرکزے یا Neucleous وجود میں آئے، Big bang کے کئی ملین سالوں بعد تک وجود میں آنے والی گرمی ایک مقرر رفتار سے ٹھنڈی ہوتی رہی، پھر پروٹون اور الکٹرون کے باہمی میل سے ہائیڈروجن کے جوہر وجود میں آئے۔گو کہ یہ معلومات حیرت انگیز ہیں، تاہم سائنس کی اِن معلومات کو کبھی حتمی نہیں کہا جاسکتا۔1929ء کے بعد سے آج تک مزید انکشافات کے سبب اس تھیوری میں تبدیلیاں ہوتی چلی جارہی ہیں۔مثلاً فضا میں ہیلیم گیس کی غیر موجودگی سے کئی نئی تحقیقات سامنے آرہی ہیں۔اس ساری صورتحال میں ہمیں دو سبق ضرور ملتے ہیں۔اولاً یہ کہ خالقِ کائنات کی قوت کا اندازہ لگانا کسی مخلوق کے بس کی بات نہیں۔ثانیاً، یہ کہ ایک طرف اس کائنات کو صور میں ایک ہی پھونک سے ختم کرنے کے بعد صور میں دوسری پھونک سے، ایک لمحے کے توقف کے بغیر اپنی مرضی کی شکل وصورت میں وہ دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔اِن دونوں اسباق کا تذکرہ خالقِ کائنات نے اپنی کتاب میں کردیا ہے اور ایک تیسرے سبق کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔یہ تیسرا سبق ہمیں چالیسویں سورہ کی ستاونویں آیت میں موجود ہے کہ: ”آسمانوں اور زمین کی تخلیق انسانوں کی تخلیق سے بھی بڑا کام ہے! لیکن انسانوں کی اکثریت اس کا احساس نہیں کرپاتی۔“

یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس سے سائنسدانوں کی ایک بڑی تعداد بے خبر ہے۔اگر وہ بندگانِ خدا، جنہیں کتاب اللہ کی امانت دی گئی، ان آیتوں میں موجود حقائق سے اِن زیرک انسانوں کو باخبر کردیں تو کیا عجب کہ یہ لوگ بھی آخرت کے انجام سے واقف ہوجائیں اور اپنی مغفرت کی فکر کرنا شروع کردیں۔ورنہ ہوگا یہ کہ یہ حضرات صرف کائناتی حقائق کے ثبوت ہی

پہنچاتے پہنچاتے خدا کے حضور بے نیل و مرام پہنچ جائیں گے اور اہلیانِ کتاب کو کوستے رہ جائیں گے کہ انہوں نے کبھی قرآنی حقائق سے ہمیں آشنا نہیں کیا۔ کیا عجب کہ اُخروی ناکامیابیوں کے غار میں انہیں بھی دھکیل دینے کی یہ سائنسدان ایک بڑی وجہ بن جائیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ جن کے پاس اللہ کی کتاب ہے وہ کتاب اللہ سے اپنے رشتے کو مضبوط کرنے سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ وہ محدود فروعی معاملات، رسم و رواج اور طریقہ ہائے عبادت کی جزئیات میں گم ہو کر رہ گیے ہیں۔ ورنہ سائنسی علوم میں مہارت کے ساتھ ان تمام علوم کے مثبت استعمال کے ذریعہ انسانیت کے دکھوں کا مداوا اب بھی ممکن ہے۔ یہ دنیا اپنی حسین و جمیل تابنا کی کے ساتھ تمام باشندوں کے لئے امن و شانتی کا گہوارہ بن سکتی ہے۔ انسانیت کی انسانیت اپنی زندگی کی آخری منزل یعنی آخرت میں اپنے رب کی رضا اور مغفرت حاصل کرنے کی طرف مائل ہو سکتی ہے، ابدالآباد جنت کی مستقل و پائیدار آسائشوں کی حقدار بن سکتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اتنی کاملیت کے ساتھ ایک ہی bang میں کس نے اس کائنات کو وجود بخشا؟ کون ہے جس نے ان ساری چیزوں کی تخلیق فرمائی؟ پھر ان کے وجود کا مقصد کیا ہے؟ کیا یہ سب محض یوں ہی بے مقصد پیدا کیے گیے ہیں۔؟ یہ اور ایسے سوالات کی تحقیق کے لئے اگر انسانیت کے سامنے آسمانی کتاب ہوتی تو ایک طویل عمر کی ضرورت نہ پڑتی۔ لیکن واضح رہے کہ یہ تحقیق اُس تحقیق سے اہم نہیں کہ جس میں یہ معلوم کیا جائے کہ ہمارا مقصدِ پیدائش کیا ہے؟ اور ہماری وجہِ تخلیق کیا ہے؟ یہ کوشش ہمیں اس حقیقت کی طرف لے جاتی ہے کہ ہم یہاں تھے نہیں بلکہ بھیجے گئے ہیں اور ہمیں اپنے مقررہ وقت پر یہاں سے لوٹ بھی جانا ہے۔ پھر سوال یہ اُٹھتا ہے کہ کہاں لوٹ کر جانا ہے اور دنیا میں ہمارے قیام کے بعد ہماری حتمی منزل کیا ہے؟ رب ذوالجلال ہم سے تیئیسویں سورۃ کی ایک سو پندرھویں آیت میں ہم سے پوچھتا ہے: ''انسانو! کیا تم یہ سوچتے ہو کہ ہم نے تمہیں یونہی بے مقصد پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف لوٹ کر آنا نہیں ہے؟'' ہر ایک انسان کو اپنے اپنے وقت پر لوٹنا ہے، موت پر کبھی فتح نہیں پائی جا سکتی، زندگی اور موت کے خالق ہی نے چھپن ویں سورہ کی ساٹھویں آیت میں اعلان کر دیا ہے کہ: ''ہم نے تمہاری تقدیر میں موت کو لکھ دیا ہے اور تم (ہمیں اس سے روک نہیں سکو گے) سبقت نہیں لے جا سکو گے۔'' پھر اس موت کے بعد ہمیں جانا کہاں ہے اور وہاں کیا ہونے والا ہے؟ اس کے جواب میں ہماری موت اور حیات کا مالک ہم سے پندرھویں سورت کی پچاسیویں اور چھیاسیویں آیات میں ہمیں اپنے

جواب سے سرفراز فرماتا ہے: ''اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، نہیں تخلیق کیا مگر ایک با مقصد حق کے ساتھ اور بے شک قیامت کی ساعت کا لمحہ ضرور آکر رہے گا۔ سو جو لوگ ان حقائق کو نہیں مان رہے ہیں ان سے پر وقار طریقے سے درگذر کریں۔ بے شک آپ کا رب ہی خلّاق ہے اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔''

یہ حقیقت ہمیں فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ایک ہی 'کُن' اور Bang کو ایک بار پھر وقوع پذیر ہونا ہے، جب ساری کائنات ایک ہی لمحہ میں ختم کردی جائے گی۔ جسے قرآنِ حکیم ''صور میں پھونک'' کہتا ہے، پھر ایک اور 'کُن' کے ساتھ تمام ذی اختیار مخلوق اپنے دفترِ اعمال کے ساتھ کھڑی ہوگی جسے دنیاوی زندگی کے امتحان میں شریک کیا گیا تھا۔ پھر حساب لیا جائے گا کہ اِس مخلوق نے اپنے فرائض نبھائے یا نہیں؟ اپنی ذمہ داریاں ادا کیں یا نہیں؟ انہیں اپنی ہستی کی پہچان ہوگئی تھی یا نہیں؟ یا وہ پنی طاقت کے نشے میں چور ہی رہے! کہیں ایسا تو نہیں کہ انسان نے اپنی طاقت کو اپنی جیسی مخلوق کی فلاح و بہبود پر استعمال کرنے کے بجائے مظالم ڈھانے کے لیے استعمال کیا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ جس مقام پر اُسے رب نے آباد کیا تھا وہاں وہ اپنے گردوپیش کے لیے بے ثمر ثابت ہوئی اور باعثِ فساد بن گئی؟ اپنے فرائض کی انجام دہی کو اپنی من مانیوں کے حوالے کیا؟

حقیقتاً دوسروں کی فکر سے زیادہ ہمارے لئے اہمیت اس سوال کی ہونی چاہئے کہ ہمارے کیا فرائض ہیں، جنہیں ہمیں سرانجام دینا ہے؟ پہلے تو یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کس نے ان فرائض کو ہم پر عائد کیا ہے؟ اِن فرائض کی مکمل بجا آوری پر کس صلہ کی ہمیں اُمید ہونی چاہیے؟ ورنہ کس سزا کا ہمیں اندیشہ لاحق ہونا چاہیے؟ پھر یہ کہ ان سوالات کے جوابات کے ہم خود مکلّف ہیں یا ہمیں اپنے خالق، مالک اور ربِّ اعلیٰ سے رجوع ہونا ہوگا۔! سچی بات تو یہ ہے کہ ہم ان بنیادی سوالات کے جوابات دینے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ ''صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے'' کے مصداق ہم دعوت دیتے ہیں کہ ہم سب مل کر اپنے خالق ہی سے پوچھیں کہ پروردگار! ہمیں اِن اُمور میں اپنی رہنمائی سے نوازیو....! رب تعالےٰ کا ہم پر احسان ہے کہ اُس نے کتابِ ہدایت میں ہمارے اِن سارے سوالوں کے جواب پہلے ہی صاف اور واضح طور پر عطا کردیے ہیں۔ وہی کتابِ ہدایت جس کے سوا کوئی کتاب ہدایت نہیں....جو عرشِ اعظم سے عربی مبین میں نازل شدہ ہے اور آج بھی دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں یہ موجود نہیں۔ ہر شخص کو کم از کم اتنی کوشش تو ضرور

کرنی چاہیے کہ وہ اپنے مالک کے احکام کا علم حاصل کرے۔ دنیا میں کسی کو دو وقت کی روٹی بھی بغیر محنت کے میسر نہیں آتی۔ لیکن مالک کے احکام معلوم کرنے کے لیے اتنی محنت کی ضرورت بھی نہیں۔ بس اتنا کرنا ہے کہ کتابِ ہدایت سے رشتہ ایک بار استوار ہو جائے، ہر روز اس سے یہ معلوم کیا جائے کہ ہمارے کن کاموں سے رب ناراض ہوتا ہے اور کن کاموں سے اُس کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ اُس کی نظر میں ایک کامیاب زندگی کیا ہے۔ یہی ایک محفوظ راستہ دکھائی دیتا ہے ہماری دنیا کی زندگی کو سدھارنے کا اور یہی ایک راستہ باقی رہتا ہے ہماری دوسری اور آخری زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کا۔

تری عظمت کے مقابل مرا سجدہ کیا ہے
کوہ احسان ترے شکر مرا رائی ہے

صحابہ کرام کے نقوش کو مشعل راہ بنانے کی ضرورت

از: سہیل اختر قاسمی

اشاعت اسلام، کار تبلیغ ودعوت، اسلامی تعلیمات کو وسیع ورائج کرنے اور تعلیم قرآن وحدیث میں عظیم ملی وشرعی فریضہ کی ادائیگی میں جدوجہد، تگ ودو اور سعی پیہم کرنے والوں میں سب سے اعلیٰ، ارفع اور قائدانہ مقام طبقۂ صحابہ کا ہے، اسلام کا کل کائنات میں پھیلا ہوا موجودہ عالمی منظر نامہ، وسیع دائرہ اسلام اور لامحدود جغرافیہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سنہری کوششوں، مخلصانہ کاوشوں، بے پناہ جدوجہد اور مساعی جمیلہ کی رہین منت ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اسلامی تاریخ، اشاعت اسلام کے حوالے سے صحابۂ کرام کے بنیادی رول، اساسی کردار اور قائدانہ جدوجہد کے تذکرہ کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتی بلکہ درحقیقت خود اسلامی تاریخ اس وقت تک اسلامی نہیں جب تک کہ وہ صحابہ کرام کے لافانی نقوش سے مملو، نہ ہو، اس بنا پر اشاعت اسلام کے حوالے سے تذکرۂ صحابہ تاریخ اسلام کا ایک لازمی عنصر اور لابدی عنوان ہوتا ہے، اشاعت اسلام میں صحابہ رضوان اللہ اجمعین کا دعوتی مقام، تبلیغی کردار اور ان کی ذاتی واجتماعی جدوجہد اور تگ ودو، تاریخ اسلام کا وہ اٹوٹ حصہ ہے جس کے بغیر اسلامی تاریخ کی معنویت مبہم بلکہ موہوم ہو جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اسلامی دعوت وتبلیغ کی راہ میں حائل موانع، سخت ترین دشواریوں، طبقاتی کشمکشوں اور ڈھیر سارے، بے شمار مسائل ومصائب کے باوجود، بھرپور ثبات قدمی کا مظاہرہ کیا، اسلام کی تبلیغ اور اس کے نشر واشاعت کی غرض سے تن من سب کی بازی لگادی اور ایسی قربانیاں دیں کہ آج تک اقوام عالم ان کی سرفروشی، جانکاہی، بردباری، تحمل مزاجی، مال وزر کی قربانی اور ان کے جذبۂ فداکاری کو فراموش نہیں کرسکی جب کسی ملک، کسی علاقے یا کسی شہر میں اسلام کے پس منظر اور مسلمانوں کے وجود کی بابت، کوئی واقعاتی پہلو قابل وضاحت ہوتا ہے یا کہیں اسلام کے حوالے سے اس کے مبلغین اور اشاعت اسلام کے نقباء کو

جاننے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس مقام پر صحابہ کرام کی تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کی راہ میں لامتناہی اور بے شمار جدوجہد کی لکیریں درج اور زبردست مساعی وقربانیوں کی داستانِ عزیمت ودعوت ثبت ہوتی ہیں۔

ان تاریخی حقائق اور معروضی سچائیوں سے واقفیت کے بعد یہ سوال، کہ اشاعت اسلام میں صحابہ کرام کا مقام کیا ہے؟ ایک فاضل اور لایعنی سوال ہوگا کیونکہ اس موقع پر اشاعت اسلام اور صحابہ کرام کے مقام اور کردار کے امتیاز کے حوالے سے کسی بامعنی عنوان کی تعیین اور اسلامی تبلیغ میں ان کی بے مثال شراکت وحصہ داری کی تحدید، کمال تحقیق وتدقیق اور تفتیش ومکمل احاطے کے باوجود ادھوری اور ناقص ہی رہے گی اور اس پر مزید تحقیق وبیان کا طالب رہے گی، وجہ ظاہر ہے آخر ہم ان کے عظیم اور لافانی مقام، تاریخ اسلام میں انمنٹ نقوش، تبلیغ و دعوت کے تئیں ان کی بے پناہ التفات وتوجہ، جدوجہد، جذبۂ فداکاری وجاںثاری اور بےنظیر وبے بدل مساعی جمیلہ پر تبصرہ کریں تو کس پہلو سے تبصرہ کریں؟ ہر پہلو اپنے باب میں اتنی وسعت، گہرائی اور گیرائی رکھتی ہے کہ اگر طویل ترین مقالات بھی رقم کیے جائیں تب بھی تشنگی اور عدم سیرابی باقی ہی رہے گی اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صحابہ کرام کی سیرت نگاری، ان کے حالات وواقعات اور زیست کے نقوش کی تاریخ طرازی، ایک لافائدہ معروضہ ہوگی، بلکہ اس وضاحت کا مفہوم یہ ہے کہ صحابہ کرام کی زیست، ان کی دینی ودعوتی سرگرمیوں، اعلیٰ اخلاقی اقدار، ملی ومذہبی خدمات، تبلیغی واشاعتی کارکردگیوں اور ان کے احوال و واقعات پر اتنا کچھ کہے جانے کے بعد بھی یہ ضرورت ہے کہ ان پر خوب لکھا جائے، ان کی زندگی کے تمام گوشوں کو نئی نسل کے سامنے ہویدا کیا جائے اور انہیں صحابہ کرام کی خدمات، قربانیوں اور اسلام کے تئیں مکمل جاںثاری کے جذبات سے آگاہ کرایا جائے اور اتنا لکھا جائے اور برتا جائے کہ ہم بھی اپنے اندر صحابہ جیسی عزیمتیں، ہمتیں اور حوصلے محسوس کریں اور انہی نقوش پر چلنے کی ابتدا کریں جن پر صحابۂ کرام نے ایک طویل سفر طے کیا تھا۔

اسلام نے اپنی پیدائش کے بعد اپنی افزائش کی ذمہ داریاں صحابہ کرام پر عائد کی اور انہیں ہی اسلام کی تبلیغ واشاعت اور اس کی حقانیت واجتماعیت کے اثبات کے لئے متعین ومنتخب کیا اور یہ انتخاب صحیح معنوں میں موزوں اور بروقت تھا کیونکہ صحابہ کرام نے نہ صرف ذمہ داریاں قبول کیں بلکہ انھوں نے ان ذمہ داریوں، فرائض اور ان حقوق کی ادائیگی میں جو دعوت وتبلیغ کے ضمن میں آتے ہیں، کبھی بھی کوئی خامی نہیں رہنے دی، دعوت وتبلیغ کے تمام حقوق کی ادائیگی میں مکمل اخلاص

اور اتمام کا مظاہر کیا اور اپنے مابعد نسلوں کے لئے ایک نمونہ اور مشعل راہ چھوڑ دیا، حضور پرنور کی وفات کے بعد صحابہ کرام کے لئے ان کا سب سے قیمتی سرمایہ مدینۃ الرسول ﷺ کی یادیں اور وہاں کی فضا، تھا، یثرب کا پیارا احساس ان کے لئے توشۂ زیست تھا، مدینے کی گلیاں ان کے لئے حسین تر جنت کی بل کھاتی خوبصورت پگڈنڈیاں تھیں، اور پھر ان سب علائق کے ساتھ وہ حکایات جن کے تانے بانے شہر رسول کے ذرہ ذرہ سے مربوط تھے ان کی زندگی جینے کا جواز تھی ان تمام نیرنگیوں کے باوجود دین محمدی کے اعلاء وفروغ کیلئے صحابہ کرام نے دیگر شہر وممالک کا قصد کیا اور تبلیغ اسلام کی بھرپور سعی کی، بعض صحابہ مکہ مکرمہ میں فروکش ہوئے اور تعلیم دین کا سلسلہ چل پڑا، مرکزیت کے حامل شہر کعبہ میں اقامت، ان کی خوش نصیبی بھی تھی اور ذمہ داری بھی، عیاشؓ بن ابی ربیعہ المخزومی، عبداللہ بن ابی ربیعہ المخزومی، عکرمہ بن ابی جہل، عتاب بن اسید، خالد بن اسید، حکم بن ابی العاص، صفوان بن امیہ رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے درجنوں صحابہ مکہ مکرمہ میں درس وتدریس اور کارِ تبلیغ میں مصروف تھے۔

کچھ صحابہ کوفہ کو سدھار گئے، جو مسلم مجاہدین کا ہیڈ کوارٹر تھا بالخصوص حضرت علی کی خلافت کی مرکزیت کی وجہ سے تشریف آوری زیادہ ہوئی مشاہیر صحابہ میں علی ابن ابی طالب، سعد ابن ابی وقاص، سعید بن زید بن عمر بن نفیل، نعمان بن بشیر، مغیرہ بن شعبہ، جریر بن عبداللہ البجلی، عدی بن حاتم الطائی، اشعب بن قیس، جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں ان میں سے اکثر حضرات آخری عمر تک کوفہ میں رہے اور وہیں مدفون ہوئے ان حضرات کے درس وتدریس اور مسند علم و فضل کا چرچہ کوفہ میں صدیوں تک رہا۔

کچھ نے بصرہ کی پربصیرت کوچوں میں علم حدیث اور معرفت قرآن کی بساطیں بچھائیں اور خوب خوب جواہر اور فن پارے لٹائے، معقل بن یسار، ابوزہرہ الاسلمی، عبداللہ بن مغفل المزنی، ابوبکرہ، انس بن مالک، ثابت بن زید، اقرع بن حابس، عثمان بن ابی العاص، ابوالعشر اء الدارمی رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ مختلف صحابہ نے بصرہ میں تعلیم دین کی کمان سنبھال لی اور اپنی خدمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی تبلیغ کے لئے وقف کردی، عبداللہ بن عمرو، خارجہ بن حذافہ، ابوبصرہ الغفاری، ابوفاطم الایادی ابوجمعہ الشموس البلوی اور دیگر صحابہ نے مصر میں تعلیم دین کا ایک سلسلہ شروع کیا۔

فتوحات مصر اور حضرت عمرو بن ابی العاص کی وہاں فروکشی کے بعد مرکز خلافت کی جانب

سے تعلیم و تعلّم اور اسلام کی اشاعت و تبلیغ کے لئے صحابہ کرام کی ایک مختصر جمعیت مصر بھیجی گئی، اس جمعیت کے جلو میں بعض دیگر صحابہ بھی تشریف لے آئے، مشہور سپہ سالار اسلام عبیداللہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے جب شام پر یلغار کی اور اسے مملکت اسلامیہ میں داخل کرلیا، تو اشاعت دین کی غرض سے بلال بن رباع المؤذن، عبادہ بن الصامت، معاذ بن جبل، مسعود بن عبادہ، شرجیل بن حسنہ، خالد بن ولید، عیاض بن غنم، فضل بن عباس بن عبدالمطلب، شداد بن اوس، معاویہ بن ابی سفیان، بسر بن ابی ارطاۃ وغیرہ تشریف لے گئے، جزیرے میں بھی بعض صحابہ عفان بن عمیرۃ الکندی، وابصہ بن معبد الاسدی، ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہم وغیرہ کی موجودگی اشاعت دین کی غرض سے ہی تھی اور خراسان جیسے اجنبی دیار میں بریدہ بن حصیب الاسلمی (مدفون بمرو) ابوبرزہ الاسلمی، حکم بن عمر الغفاری، عبداللہ بن الخازم الاسلمی، قثم بن عباس رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ کا قیام اشاعت دین کے اغراض پر مبنی تھا۔

تبلیغ و دعوت کا کام ان کے لئے کوئی آسان لقمہ نہیں تھا کہ اس کو بسہولت نگل لیا جائے بلکہ یہ کام ان جانثار مجاہدوں کے لئے لوہے کا چنا ثابت ہوا تھا، اس راہ میں انھوں نے جتنی تکالیف اٹھائی ہیں جتنی مشقتیں برداشت کی ہیں اور جتنے مصائب کو خندہ پیشانی سے سہا ہے، وہ سب تاریخ کے صفحات میں درج ہے، قرآن کریم نے ان کی انہی خدمات اور جذبۂ جانثاری کے وسیلے میں یہ اعلان کیا کہ ان ''اصحاب نبی'' کو رضائے خداوندی اور خوشنودی ایزدی جیسی قیمتی نعمتیں مل گئیں ''رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ''

صحابہ کرام کی سوانحات پر مشتمل دستاویزی کتب کے مطالعے کے بعد یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام کی اشاعت کی راہ میں ان کے کیا اور کیسے خدمات ہیں؟ حالات کے حد درجہ ناسازگاری کے باوجود اسلام کو عروج واستحکام بخشنے میں ان کا کردار کیا ہے؟ اسلامی شریعت کے عملی نفاذ میں خود ان کی جانب سے عملی اطاعت کس نوعیت اور کس درجے کی تھی؟ کفار کے تعاقب، مصائب کی گھما گھمی اسباب و وسائل کے یکسر فقدان اور دشمنوں کی شدید مخالفت کے باوجود اسلام کو ایک مضبوط اور ٹھوس پلیٹ فارم بنانے میں ان کا کیا کردار رہا ہے؟ مزاحمت اور ردعمل کے کیا اسلوب تھے؟ دعوت و تبلیغ کے کیا مناہج تھے؟ خطرات کے ازدحام، دشمنوں کی شدت انگیزیوں اور بھرپور اقدامات کے باوجود مسلمان اور اسلام محفوظ کیونکر رہا؟ ان سوالوں کے جوابات صحابہ کی بہترین اور مثالی زندگی کے مطالعاتی غور وفکر کے بعد واضح ہوجاتی ہے، سچ یہ ہے کہ صحابہ کرام کی

خدمات، جرأت اور ہمت، ان کی دانائی، دانشمندی اور لیاقت، اسلام سے محبت، غایت درجہ الفت اوراس کے تئیں جذبۂ فداکاری اور اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لئے ہمہ تن پیشی وانہماک؛ دعوت کی راہ میں حائل قوتوں سے جنگ ومزاحمت اور دشمن طاقتوں سے لوہا لینا اور ہر پہلو سے ایک فولادی، مستحکم اور ناقابل تسخیر پہاڑ ثابت ہونا اور ایسے ایسے کارنامے انجام دینا جن پر عقول انسانی آج تک دنگ ہیں ایسی روایتی یا عام سی افسانوی کہانی نہیں یا ایسا کوئی تصوراتی خاکہ نہیں کہ جس کی سچائی وصداقت پر سوالیہ نشان لگایا جاسکے۔

جن چودہ صدیوں میں جتنی تصانیف اسلام کی اشاعت اور اسکے بقاء وتحفظ کے عنوان سے معرض وجود میں آئیں وہ سب کی سب، صحابہ کرام کے خدمات جلیلہ اور بہترین کارکردگیوں کا واضح اعتراف ہیں، واقعہ نگاروں نے ایسے بے شمار تذکرے کتابیں اور تصانیف تحریر کی ہیں جو صحابہ کرام کے کردار اوران کے مقام کے تعین وانتخاب میں بدیہی دلائل کی حیثیت رکھتے ہیں دراصل معروضہ اور مقصد یہ ہے کہ صحابہ کرام کے تمام تر خدمات جلیلہ کے باوجود، مسلم طبقے میں صحابہ کرام کے تئیں اعتقادی حوالے سے وہ عملی استحکام نہیں جو ایک مسلم کے دل میں ہونی چاہئے لمحہ فکریہ یہ ہے کہ وہ حضرات جن کی انتھک جدوجہد اور تعاون کے بعد اسلام کو ایک وسیع اور عالمگیر فضا ملی انہیں ہی فراموش کردیا گیا اوران کی خدمات کو ذہول ونسیان کے خانے میں ڈال دیا گیا جو مسلم قوم کے لئے کسی بدترین المیہ سے کم نہیں۔

آج کی تاریخ میں امت مسلمہ کا موجودہ بحران اوراس کی ناقابل تدارک پسماندگی کے جو بھی اسباب ہوں اور جیسے بھی محرکات ومضمرات ہوں وہ ایک المیہ ہے دراصل آئیڈیل ہدف کی تعیین ان تمام المناک مراحل کا سد باب ہے آج اگر ہم صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مبارک زیست کے اصول اور حیات گذاری کے اسلوب کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک لائحہ عمل تیار کریں گے اوراسے برتیں گے تو عین ممکن ہے کہ مسلم کمیونٹی کے لئے دن بدن پیدا ہونے والے مسائل کی شیطانی رفتار، تھم جائے اور امت مسلمہ کی پسماندگی چھٹتی نظر آئے، لہٰذا ضروری ہے کہ ہم صحابۂ کرام کی زندگی کی طرف ایک بار دوبارہ مڑکر دیکھیں اوران کی جدوجہد سے لبریز تاریخ کے انقلابی گوشوں کو مشعل راہ بنائیں، ہوسکتا ہے؛ بلکہ عین ممکن ہے کہ امید کے امکانات روشن ہوں گے، ہمیں اپنے مسائل سے چھٹکارا ملے گا اور کھوئی ہوئی عظمت رفتہ پھر دوبارہ ہمیں مل جائے گی۔

✻ ✻ ✻

دینی وعصری علوم وفنون کی ترویج میں مسلمانوں کا حصہ

از: شفیق احمد الاعظمی
امام وخطیب مسجد وزارت اوقاف، ابوظبی

اسلام ایک آفاقی انقلاب آفریں مذہب بن کر آیا اور رسول اللہ ﷺ نے اسلامی نظام ہائے زندگی کا ایسا جامع مدلل اور کامل دستور پیش کیا جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں اور شعبوں کا احاطہ کرتا ہے، اور اسی کے ذریعہ آپ ﷺ نے ہمہ گیر ایمانی، فکری، علمی، تمدنی، سماجی اور سیاسی انقلاب برپا کیا، اسلام نے نہ صرف عربوں کی اصلاح وتربیت کرکے ان کو تحت الثریٰ سے اوج ثریا تک پہنچایا بلکہ عربوں نے حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی تحریک اصلاح کو دنیا کے گوشہ گوشہ تک پہنچانے میں سب سے سرگرم کردار ادا کیا، یہاں تک کہ اسلامی تعلیمات جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر یورپ وافریقہ اور ایشیا تک پہنچ گئیں، چوں کہ مذہب اسلام آخری اور عالمی دین ہے، لہٰذا اس نے زمان ومکان، رنگ ونسل، قوم وعلاقہ سے بلند ہوکر پوری انسانیت پر اپنے اثرات مرتب کیے، اسلامی تہذیب اور قرآنی تعلیم نے بین الاقوامی سطح پر ہر قوم وملت کو متاثر کیا، علوم وفنون، تہذیب وتمدن اور ایجادات وتحقیقات کے میدان میں ایسے نابغۂ روزگار، باکمال افراد اتارے جن کے حیرت انگیز کارناموں نے دنیا کو غرق حیرت کردیا، مسلمانوں نے ایک طرف ایمان ویقین کا ایسا مظاہرہ کیا کہ فرشتوں کو بھی رشک آنے لگا تو دوسری جانب ایسے ایسے علوم و فنون ایجاد کیے اور تحقیقات واکتشافات کے نمونے پیش کیے کہ اقوام عالم ان کی خوشہ چینی پر مجبور ہوگئیں۔

علمی انقلاب کا آغاز

اسلام نے سب سے پہلے تحصیل علم کو بنیاد بنا کر اپنے ہمہ گیر انقلاب کا آغاز کیا اس لیے علم میں ہر قسم کی روحانی ومادی ترقیات کا زینہ ہے، جو دل ودماغ کے بند دریچوں کو کھولتا ہے، کیوں کہ

علم صفت الٰہی ہے اوراس صفت کے ذریعہ اس نے انسان کوتمام مخلوقات پر فضیلت عطا فرمائی ہے، اگر انسان کے پاس علم اور عقل کا سرمایۂ افتخار و امتیاز نہ ہوتا تو پھر انسان سب سے کمتر وارذل حیثیت کا ایک جانور ہوتا، لیکن ان دونوں صفات نے اس کوممتاز ونمایاں مقام بخشا، اوراسلام نے انہیں دونوں کو اساس بنا کر نسل انسانی کوعروج وارتقاء کی چوٹیوں پر لا کھڑا کیا۔

اسلام نے تحصیل علوم کوایک تحریک کے طور پر اپنے متبعین پر لازم قرار دیا، یہاں تک کہ سب سے پہلی آیت جو غارِحراء میں محمد ﷺ پر نازل ہوئی اس میں قرأت، علم، قلم کا بطور خاص ذکر فرمایا ہے، بلکہ پڑھنے کوامر کے صیغہ ''اقراء'' کے ذریعہ واجب کردیا۔

إقرأ باسم ربك الذی خلق. خلق الانسان من علق. إقرأ وربك الاکرم. الذی علم بالقلم. علم الانسان مالم یعلم. (سورۂ علق:۱-۵)

پڑھئیے اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا انسان کوخون بستہ سے، پڑھئیے اور آپ کا رب وہ ہے، جس نے سکھلایا قلم سے، سکھلایا انسان کو وہ چیز جس کو اس نے نہیں جانا۔

علم، طلبہ، علماء کے بلند مقام کوقرآنی آیات اوراحادیث رسول ﷺ کے ذریعہ بیان فرما کر تحصیل علوم کی ترغیب دی ہے، اورعلم کو عام رکھا یہی خاص حکمت ہے، اس میں دینی ودنیوی، قرآنی اورعصری تمام علوم وفنون شامل ہیں۔ ''أثر الاسلام علی الثقافة الإسلامیه'' کے مصنف محمودعلی شرقاوی رقم طراز ہیں:

یہاں علم سے مرادصرف حرام وحلال یعنی احکام شرعیہ کا علم نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ان تمام چیزوں سے واقفیت ہے جن کے ذریعہ انسان اپنے ان فرائض اور ذمہ داریوں کوکما حقہ پورا کرسکے، جس کے لیے اسے زمین پر خلیفہ بنایا گیا ہے، یعنی زمین کی تعمیر، اس کے خزانوں کی دریافت اوراس میں چھپے ہوئے اسرار ورموز کا انکشاف، اس میں وہ علم بھی شامل ہے، جونباتات اور پیڑ پودوں کی ترقی اورنشوونما میں مددگار ہو اور زمین کی بہتر پیداوار، نیز اس کی زرخیزی میں معاونت کرے، قرآن اس علم کی طرف بھی دعوت دیتا ہے، جس کے ذریعہ حیوانات اور جانوروں کی بہتری ہوسکے، انہیں انسان کی خدمت کے لیے مسخر کیا جاسکے، اس میں اس علم کا حصول بھی ضروری ہے جس کے ذریعہ جائز طریقوں سے کسب معاش اور دولت کا حصول ممکن ہو، اس میں اس علم کی تحصیل بھی شامل ہے جس کے ذریعہ انسان مختلف امراض اور بیماریوں سے نجات پاسکے،

الغرض وہ تمام علوم جو انسانیت کے لیے مفید اور نفع بخش ثابت ہوں، قرآن کریم اور سنت نبوی ﷺ کی رو سے ہر انسان کو حاصل کرنا چاہیے، یہی وجہ ہے کہ اسلام کی نظر میں علم کو انسانی زندگی کے تمام عناصر میں اولین عنصر کی حیثیت حاصل ہے۔

مسلمانوں نے علوم دینیہ پر پہلے توجہ دی، خاص کر عہدِ رسول اور عصر صحابہ میں قرآنی و دینی علوم کی تحصیل وترویج پر زیادہ زور رہا، اس کے بعد اموی دور میں دیگر فنون پر توجہ مبذول ہوئی، اور عباسی خلافت اور اندلس میں مسلمانوں کی حکومت سے ہمہ گیر پیمانہ پر علوم وفنون کی تحصیل وترویج اور تحقیق وتجیث کا کام شروع ہوا، مسلمانوں نے مکاتب، مدارس، جامعات، تحقیقاتی مراکز، تراجم کے ادارے قائم کیے، اور ان اداروں اور مدارس سے نابغۂ روزگار علماء، فضلاء، محققین، مصنّفین، مؤرخین اور سائنسداں تیار ہوکر نکلے، اور یہ مدارس ومکاتب برابر تعلیمی وتربیتی کردار ادا کرتے رہے، اور آج بھی ان کا اپنا کام جاری ہے، اسلامی عہد خلافت میں علوم وفنون کی تحصیل وترویج کا کام جنگی پیمانہ پر ہونے لگا تھا۔

علمی سرگرمیاں اور مساجد ومدارس

پہلے پہلے مساجد میں مدارس کا کام ہوتا تھا، پھر چوتھی صدی ہجری میں سب سے پہلا مدرسہ علیحدہ عمارت میں قائم ہوا، مشہور مفکر عالم ناجی معروف لکھتے ہیں:

سب سے پہلے مدرسہ کا نام ”المدرسۃ الصادریہ“ تھا جس کی بنیاد شام میں ۳۵۰ھ میں پڑی، پانچویں صدی ہجری میں مدرسہ صادریہ کے نہج پر کئی دوسرے مدارس قائم ہوئے جن میں قابل ذکر ”مدرسہ بیہقیہ“ اور مدرسہ سعدیہ ہیں جن کی بنیاد نیشاپور میں پڑی۔ (بحوالہ نشأۃ المدارس المستقلۃ فی الاسلام ص:۵/۴) اس کے بعد اسلامی دنیا کا سب سے معروف ومقبول مدرسہ نظامیہ قائم ہوا، جس کو سلطان ارسلان سلجوقی کے علم دوست وزیر اعظم نظام الملک خواجہ حسن طوسی نے قائم کیا، اور بغداد میں ساتویں صدی ہجری میں عباسی خلیفہ مستنصر باللہ نے ۶۲۵ھ میں مدرسہ مستنصریہ کے نام سے قائم کیا، اور ۶۵۶ھ تک صرف بغداد میں اس طرح کل ۳۸ مدرسے بن چکے تھے۔ (بحوالہ نشأۃ المدارس المستقلۃ ص ۵)

فاطمیوں کے دورِ حکومت میں مصر میں بہت سے بڑے بڑے مدارس قائم ہوئے اور صرف قاہرہ میں ۲۰ جامعات قائم ہوچکی تھیں، حاکم بامر اللہ فاطمی فرماں روا نے دار العلم یا دار الحکمۃ نامی

ایک زبردست درسگاہ تعمیر کروائی تھی، جس میں ایک اعلیٰ درجہ کا عمومی کتب خانہ بھی تھا، جس میں نادر کتابوں کا عظیم الشان ذخیرہ تھا، ایوبی دورِ حکومت میں صلاح الدین ایوبیؒ کے بھائی الملک عادل نے المدرسۃ العادلۃ نام سے بنوایا، قاہرہ میں المدرسۃ الذہبیہ اور فسطاط میں المدرسۃ الناصریہ قائم کیا گیا، ایوبیوں کے دور حکومت میں مصر کے اندر ۲۵ بڑے مدارس قائم ہوئے، ہزاروں مکاتب بنائے گئے۔

اندلس میں صرف قرطبہ کے اندر الحکم المستنصر الثانی بن عبدالرحمٰن الناصر کے دور حکومت میں ۳۵۰ھ تا ۳۶۶ھ) میں ۸۰ عظیم الشان درسگاہیں تھیں، غرناطہ میں جامعہ علمیہ کبریٰ کے علاوہ جس کی بنیاد سلطان یوسف ابوالحجاج نے رکھی تھی، کل سترہ بڑے مرکزی ادارے تھے، ان تمام مرکزی ادارے میں بلا فیس تعلیم ہوتی تھی، اور طلبہ کو اسکالرشپ دی جاتی تھی۔

کتب خانے اور مراکز تراجم

علمی مراکز اور کتب خانوں کی تعمیر میں بھی مسلمانوں نے حیرت انگیز رول ادا کیا ہے، قاہرہ، بغداد، دمشق، قرطبہ، غرناطہ میں بہت عظیم الشان کتب خانے، لائبریریاں تھیں، جن میں ہزاروں نادر ونایاب کتابیں ہوا کرتی تھیں، علمی مجالس قائم ہوتی تھیں، تحقیق وتصنیف کا کام اعلیٰ پیمانہ پر ہوتا تھا، عام مطالعہ کے لیے بڑے بڑے ہال بنائے گئے تھے، بیت الحکمۃ اور خزانۃ الحکمۃ جیسے علمی مراکز میں ہزاروں علماء تحقیق میں مصروف ہوتے تھے، جن کی سرپرستی خلیفہ کرتے تھے، دوسری زبانوں کے اہم کتابوں کے تراجم ہوتے تھے، مامون رشید نے قیصر روم کے پاس سے منطق، فلسفہ کی اہم کتابوں کو منگوا کر ان کا ترجمہ کرایا، اور عربی زبان میں منتقل کرایا۔ (ضحیٰ الاسلام ج:۲، ص:۶۱، مصنف احمد امین مصری)

اندلس کے فرماں روا حکم بن ناصر نے قرطبہ میں اپنے محل کے اندر ایک عظیم الشان کتب خانہ بنایا تھا، جس میں ۴ لاکھ کتابیں تھیں، ''اعلام العرب فی الکیمیا'' کے مصنف لکھتے ہیں کہ ''خالد بن ولید بن معاویہ نے سب سے پہلے یونانی علوم کو عربی زبان میں منتقل کرایا، اس سلسلہ میں ان کو اولیت حاصل ہے'' (ص:۱۷)

ابتداء میں یونانی، سریانی اور فارسی کتابوں کے عربی تراجم بہت گنجلک ہوا کرتے تھے، خالص لفظی تراجم کا التزام تھا، مگر آٹھویں صدی ہجری میں حنین بن اسحاق نے سلیس رواں اور

بامحاورہ عربی میں ترجمہ شروع کیا، انھوں نے عربی زبان میں مہارت خلیل بن احمد فراہیدی کے شاگردوں سے حاصل کی تھی، روم کا سفر کرکے وہاں یونانی زبان پر قدرت حاصل کی، اس کے بعد فصیح وبلیغ رواں اور دل کش تراجم کا رواج عام ہوتا گیا، عباسی خلفاء کے دربار میں حنین بن اسحاق کو عزت ومنزلت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، مامون رشید ان کے تراجم کو عزیز رکھتا تھا، اور سبھی مترجمین کو کتاب کے وزن کے بقدر چاندی سونا دیتا تھا۔ (الاعلام ج:۲،ص:۲۲۷)

فارس کے لوگوں نے جب اسلام قبول کیا اور اپنی صلاحیت ولیاقت سے دربار خلافت میں بلند مرتبہ پایا تو علماء فارس نے ترجمہ کے میدان میں اہم کارنامے انجام دیے، عبداللہ بن المقفع نے کلیلہ دمنہ جیسی اہم ادبی کتاب کو فارسی سے سلیس فصیح رواں عربی میں منتقل کیا، جس پر ترجمہ کا گمان تک نہیں ہوتا، اس کے علاوہ منطق وطب کی بعض اہم کتابوں کا بھی عربی میں ترجمہ کیا ہے، فلسفی ابویوسف یعقوب نے بھی کتابوں کے تراجم میں بہت اعلیٰ پیمانہ پر کام کیا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ترجمہ وتالیف کی علمی وفکری تحریک مامون کے زمانہ میں خوب پروان چڑھی، مشہور مستشرق کارل بروکلمان کہتا ہے کہ ابویوسف یعقوب نے ترجمہ کے ذریعہ ارسطو اور افلاطون کے فلسفے سے اپنے ہم وطنوں کو متعارف ہی نہیں کرایا بلکہ اس نے فلسفہ پر کتابیں بھی تالیف کیں۔ (بحوالہ المامون خلیفہ العالم ص:۱۱۶، از محمد مصطفیٰ ہدارہ)

علم فلکیات اور مسلمان

علم فلکیات میں مسلمانوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، اس فن میں انھوں نے کافی ترقی کی تھی، عباسی خلیفہ مامون الرشید نے بغداد میں بیت الحکمۃ قائم کیا تھا، جس میں ہزاروں نادر ونایاب کتابوں کے علاوہ ایک فلکی درس گاہ بھی بنائی تھی، جس میں ماہرین فلکیات کا ایک گروہ ستاروں کی حرکات وسکنات پر نگاہ رکھتا تھا، اور اس نے ستاروں کی چال معلوم کرنے کے لیے خبر بھی تیار کی تھی، اور زمین کے حجم کو ناپنے کا آلہ بھی تیار کیا تھا، زمینی وفلکی دوریاں ناپنے کے لیے جن مسلم سائنسدانوں نے آلہ تیار کیا تھا، اس میں سرفہرست خالد بن عبدالملک مروزی، سند بن علی اور علی بن عیسیٰ اضطرلابی ہیں، اور بیت الحکمۃ کا سربراہ ونگراں یحییٰ بن ابی منصور اس ٹیم کا صدر تھا، اور رات دن کی عرق ریزی کے بعد ۲۱۵ھ تا ۲۱۷ھ کے درمیان بغداد کے جبل کاسیہ اور دمشق کے جبل قاسیون پر اضطرلاب (فلکی آلہ) کا کامیاب تجربہ کیا گیا، علم فلکیات کے ماہرین میں موسیٰ

بن شاکر، ابومعشر بلخی اور ثابت بن قرہ اور بیرونی دبوز جانی کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی اوران کی کتابوں کا لاطینی زبانوں میں ترجمہ ہوا جس سے یورپ نے بھرپور استفادہ کیا۔

علوم طب کی اشاعت میں مسلمانوں کا حصہ

اسلام نے علم الطب کو حفظان صحت کے لیے اللہ کا انعام قرار دیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے علاج ومعالجہ کے لیے بہت سے طبی اصول اور نسخے صحابۂ کرامؓ کو بتائے اور سکھائے، طب نبوی سے متعلق احادیث کا اہم ذخیرہ موجود ہے، خاص کر شہد کے فوائد، کلونجی، مسواک وغیرہ کے طبی فوائد سے متعلق احادیث اہم کتابوں میں مذکور ہیں۔ مسلمانوں نے علم الطب پر زبردست کام کیا ہے، اوراہم ترین حکماء اور اطباء کا ایک سلسلۃ الذہب ہے، رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارکہ میں صحابہ کرامؓ علاج تو کرتے ہی تھے، آپ نے غیرمسلموں سے بھی علاج میں مدد لی ہے، حضرت سعد بن معاذ کے علاج کے لیے حارث بن کلدہ سے کہا تھا جو غیرمسلم تھا، عہد وسطیٰ میں اسلامی طب کی کئی شاخیں ہوگئی تھیں جن کے ماہرین اطباء ہوتے تھے۔

مسلمانوں نے علوم طب پر اہم ترین تصنیفات سے دنیا کو مالا مال کیا ہے، ابن سینا نے فن طب میں ''القانون'' جیسا انسائیکلوپیڈیا تیار کردیا، اس میں عرب، یونان اور سریان واقباط کے طبی اصولوں اور علوم کو جمع کیا ہے، پھراس نے اپنے تجربات بھی تحریر کیے ہیں، ۷۶۰ دواؤں کی تشخیص کی ہے، القانون کو گیرارڈ کریمونا (Gerard Cremona) نے لاطینی زبان میں منتقل کیا، علی ابن عباس ''وفات ۹۹۴ء'' کی مشہور کتاب الملکی فی الطب یورپ میں چھ صدی تک متداول رہی۔ (بحوالہ تاریخ العرب العام ج:۲،ص:۷۷)

اسی طرح خلف بن قاسم زہراوی (وفات ۱۰۱۳ء) کی کتاب ''التصریف لمن عجز عن التالیف'' یورپ میں بہت مقبول رہی، اس میں زہراوی نے سرجری وآپریشن کی تشریح کی ہے، مثانہ کی اندرونی پتھری کو توڑنے کا طریقہ بتایا ہے، اور شریانوں کے جوڑنے کے طریقے بھی بتائے ہیں، یورپ میں یہ کتاب ایک مرجع وماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ حنین ابن اسحاق نے آنکھوں کے امراض سے متعلق ''العشر المقالات فی العین'' تحریر کی، آنکھوں کے علاج میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے، اسلامی عورتوں نے بھی طبی خدمات میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں، عہد رسول میں حضرت رفیدہ الانصافیہ کا جنگی زخمیوں کی مرہم پٹی کے لیے کیمپ لگتا تھا، ام عطیہ الانصاریہ اور نسیبہ بنت کعب

رضی اللہ عنہن نے غزوۂ احد کے زخمیوں کا علاج خیموں میں کرتی تھیں۔

مغربی محققین کا ماننا ہے کہ عربوں نے ہی سب سے پہلے علم ادویہ ایجاد کیا ہے، بعد میں اس فن کو یورپ نے اختیار کیا، انہیں اصولوں پر جدید میڈیکل سائنس کی بنیاد پڑی، آج بھی بہت سی دواؤں کے نام عربی ہی میں یورپ کی طبی ڈکشنریوں میں ملتے ہیں، عربوں نے ہی دواخانہ کو ترقی دے کر بامِ عروج تک پہنچایا، دواخانہ کے کالج کی بنیاد رکھی، ڈسپنسری کے کالج قائم کیے، سب سے پہلے ''سابور بن سہل'' نے دواسازی کی کتاب لکھی اور دواؤں کے ناموں کا رجسٹر تیار کیا، عرب مسلمانوں کی تحریر کردہ چند انتہائی مشہور کتابوں میں سے رازی کی کتاب ''حاوی'' انطار کی کتاب ''تذکرہ دوار'' اور ابن بیطار کی کتاب ''الجامع المفردات الادویہ والاغذیہ'' بیرونی کتاب ''کتاب صیدلہ، کتاب العقاقیر''

علم کیمیا اور مسلم سائنسداں

علم کیمیا میں بھی مسلم سائنسدانوں کا نام سرفہرست آتا ہے، جابر بن حبان کو علم کیمیا کا باوا آدم کہا جاتا ہے، ابن خلدون علم کیمیا کو جابر بن حبان کی طرف منسوب کرتے تھے۔ (مقدمہ ابن خلدون:۴) ابن حبان نے علمی تجربہ اور ملاحظات کی بنیاد پر اپنی کیمیائی تحقیق کا آغاز کیا، اس نے سب سے پہلے سارے کیمیائی تجربات جیسے تبخیر، تقطیر، کشید، تکلیس، (Caleinateon) اور ازالہ (پگھلانے) کا ذکر کیا ہے، اور اطبار میں سب سے بڑا کیمیا دان ابوبکر رازی (وفات ۹۹۴ء) کو مانا جاتا ہے، ان کی کتاب سرالاسرار کا ترجمہ ''جے روسکا'' نے کیا ہے، اور اس کی شرح بھی لکھی ہے، دوسرے مشہور کیمیا دان ''علی جلدکی'' (وفات ۱۳۶۲ء) کا نام آتا ہے، جنھوں نے جوہر کا انکشاف کیا ہے، اور معدنیات وکیمیائی عناصر میں جوہر کے راز کو بتایا۔

علم الطبیعہ

علم الطبیعات پر قدیم دور کے مسلم علماء کے تجربات بہت قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، مشہور ماہرین میں حسن ابن ہشیم (وفات ۱۰۲۹ء) اور ابوریحان البیرونی (وفات ۱۰۴۸ء) میں ابن الہشیم علم الریاض کا بھی ماہر مسلم سائنسدان تھا، اس میں اس کی شہرت زیادہ ہے، اس نے روشنی کے انعکاس کو واضح کیا، اور سائنٹفک طریقہ پر روشنی کے عکس کا مطالعہ کیا، اس کا کہنا تھا کہ روشنی

مرئیات سے پھوٹتی ہے، اور یہ ایک انقلابی تحقیق تھی، اس کی شہرۂ آفاق کتاب ''المناظر'' ہے جس کا ترجمہ انگریزی میں ''فریڈریک ریزنر'' نے کیا ہے اور کنزالبصریات کے نام سے سوئزرلینڈ سے شائع ہوئی ہے، یورپ کے مشہور سائنسدانوں جیسے وائی ٹلو، روجر بیکن، اور لیونارڈ ومینسی، کلیر وغیرہ اس کتاب سے بے انتہا متأثر تھے، اور اس کو معلومات کا خزانہ کہتے تھے، ابوریحان البیرونی کا علم الطبیعات وعلم الریاضیات کے مشہور مسلم سائنسدانوں میں شمار ہوتا ہے۔ مستشرق ایڈورڈ سخاؤ کہتا ہے کہ تاریخ عالم کا سب سے زیادہ عقل مند شخص بیرونی ہے، اور زمین کی کشش کے سلسلے میں نیوٹن نے بیرونی اور ابن سینا کے افکار ونظریات کی مدد سے ضابطۂ کشش کی راہ ہموار کی۔ (بحوالہ اثر العرب فی الحضارۃ العربیۃ ص:۱۴۰)

لیکن جب مسلمانوں میں علمی وفکری زوال آیا تو یہ تمام علمی سرمایہ یا تو یورپ منتقل ہوگیا جس پر یورپ نے اپنے علم وفن کی بنیاد رکھی اور بے مثال ترقی کی، یا پھر اس کا اکثر حصہ ضائع اور برباد ہوگیا، کچھ تو تاتاریوں کی یورش سے اور کچھ دوسرے اسباب وعوامل سے اور مسلمان طاؤس ورباب میں مشغول ہوکر انحطاط وزوال کے راستے پر چل پڑے جس کا نتیجہ آج مسلمانوں کی محکومیت ومظلومیت کی شکل میں ہم دیکھ رہے ہیں، علامہ اقبال نے اسی کو اپنے درد بھرے انداز میں فرمایا:

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

مآخذ ومصادر:

(۱) ضحیٰ الاسلام: از دکتور احمد امین مصری
(۲) نشأۃ المدارس المستقلۃ فی الاسلام: از ناجی معروف
(۳) فضل العرب علی الحضارۃ العالمیۃ: از احمد فواد لاہوانی
(۴) حضارۃ العرب: از کستاڈ لیبون
(۵) اعلام العرب فی الکیمیا:
(۶) المامون الخلیفہ العام: از محمد مصطفیٰ ہدارہ
(۷) مقدمہ ابن خلدون: از المورخ ابن خلدون
(۸) اثر العرب فی الحضارۃ العربیۃ: از عباس محمود عقاد
(۹) اثر الاسلام علی الحضارۃ العالمیۃ: از محمود علی شرقاوی

قرآن مجید

طریقۂ تعلیم کی تبدیلی انقلاب لاسکتی ہے

از: (مفتی) فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی
دارالسلام اسلامی مرکز، مالیرکوٹلہ (پنجاب)

قرآن مجید کی تعلیم کا روایتی طریقہ جس کے ہم عادی ہوچکے ہیں یہ چلا آرہا ہے کہ پہلے حروف کی پہچان کرائی جاتی ہے، پھر حروف کو ملا کر الفاظ بتائے جاتے ہیں اور ابتدائی قاعدے کے بعد بچہ قرآن مجید پڑھنے لگتا ہے۔ پہلے قرآن مجید ناظرہ پڑھایا جاتا ہے کہ بچہ دیکھ کر قرآن پاک پڑھنے لگے۔ اگر کسی کو حافظ قرآن بنانا ہوتا ہے تو تھوڑا تھوڑا کرکے اس کو بغیر دیکھے یاد کرایا جاتا ہے اور چند سالوں میں بچہ حافظ قرآن ہوجاتا ہے۔

یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ اس طرح قرآن لوحِ دل پر نقش ہوجاتا ہے اور ہزاروں حافظ قرآن بغیر دیکھے ہوئے پورا قرآن مجید پڑھتے ہیں۔ رمضان المبارک میں تراویح کی نماز میں سناتے ہیں، تراویح کی رونقیں اُنہیں خوش نصیب حافظوں کے دم سے قائم ہیں۔

ناظرہ یعنی دیکھ کر قرآن مجید پڑھنے والے الحمدللہ اِس امت میں ہزاروں ہزار کی تعداد میں ہیں، بے شمار لوگ ہیں جو روزانہ تلاوت قرآن کے عادی ہیں، جو روزانہ تلاوت نہیں کرسکتے وہ کبھی کبھی قرآن ضرور پڑھتے ہیں۔

نمازوں میں قرآن مجید پڑھا جاتا ہے۔ بہت سے لوگوں کو قرآن مجید کی اتنی سورتیں ضرور یاد ہوتی ہیں جو نمازوں میں پڑھی جاتی ہیں۔

مسجدوں اور مدرسوں میں ہزاروں مکاتب قرآن حکیم کی خدمت پر لگے ہوئے ہیں اور الحمدللہ امت مسلمہ میں آج بھی قرآن کا چرچا مختلف صورتوں میں پایا جاتا ہے۔

دنیا کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب قرآن مجید ہے۔ اور بڑی تعداد میں قرآن مجید شائع ہوتا رہتا ہے، اس میں قرآن مجید بلاترجمہ، ترجمہ کے ساتھ، مختلف تفسیروں کے ساتھ،

مختلف سائز میں اور تقریباً ہر زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ اور اس کی تفسیر الحمدللہ دستیاب ہے۔

یہ سب باتیں شکر اور فخر کے لائق ہیں اور جب تک قرآن زندہ ہے اسلام بھی زندہ ہے اور مسلمان بھی۔

❁ ❁ ❁

اب ہم ایک اور پہلو سے غور کرتے ہیں، بیشک قرآن مجید کی تلاوت بڑا اجر وثواب رکھتی ہے، اس کے ہر حرف کے بدلے میں دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت دلوں کا زنگ دور کرتی ہے اور ایمان کو تازگی بخشتی ہے۔ تلاوت قرآن کے یہ بہت سے مفید پہلو ہیں۔

آیئے! غور کریں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کیوں نازل کیا ہے۔ اس کے نازل کرنے کا مقصد خود قرآن کی زبان میں انسان کی ہدایت اور رہنمائی ہے۔ جب ہم قرآن مجید کی پہلی سورۃ سورۂ فاتحہ کھولتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی تعریف اس کی شفقت ورحمت کا ذکر کرنے کے بعد ہم اس کے سامنے درخواست پیش کرتے ہیں کہ:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيم

''پروردگار ہمیں سیدھا راستہ دکھا دیجئے''۔

سیدھے راستے کی طلب، ہدایت ورہنمائی کی درخواست جب بندے کی طرف سے ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی درخواست کو شرف قبولیت عطا فرماتے ہوئے اس کے سامنے کتابِ ہدایت قرآن مجید رکھ دیتے ہیں کہ لو یہ ہے وہ ہدایت جس کی تم نے درخواست کی ہے۔

معلوم ہوا کہ قرآن مجید کا اصل مقصد یہ ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر اور حالات کی ہر کروٹ میں ہم اللہ کی کتاب سے روشنی حاصل کرتے رہیں اور اس کی رہبری میں زندگی کا سفر طے کرتے رہیں۔

اللہ کے رسول خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے ہمیں یہ وصیت فرمائی کہ تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں، جب تک تم ان کو مضبوطی سے تھامے رہوگے ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ وہ دو چیزیں ہیں اللہ کی کتاب اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت۔

جس کتاب سے ہمیں رہبری حاصل کرنی ہے اس کتاب میں کیا لکھا ہے، اس کا پیغام کیا ہے، اس کی دعوت کیا ہے اور اس میں کیا کیا کمالات پوشیدہ ہیں، کیا اس کا معلوم ہونا ہمارے

لئے ضروری نہیں....؟

❁ ❁ ❁

ایک بالکل اجنبی زبان جس سے ہمارا تہذیبی تعلق نہیں ہے مثال کے طور پر انگریزی زبان، جب اس زبان کی تعلیم دی جاتی ہے تو اس کا آغاز چھوٹے سے قاعدے سے ہوتا ہے جس کو A.B.C.D کا قاعدہ کہہ دیتے ہیں۔ حرفوں کی پہچان بھی کرائی جاتی ہے...ان حرفوں سے لفظ بھی بنائے جاتے ہیں...ان لفظوں کے معنی بھی بتائے جاتے ہیں...ان کے ہجے بھی کرائے جاتے ہیں...ان کا تلفظ بھی صحیح کرایا جاتا ہے...اوران حرفوں کولکھایا بھی جاتا ہے۔

یہی طریقہ ہرزبان کے سیکھنے اورسکھانے کا ہوتا ہے۔

کیا قرآن مجید کی زبان اورقرآن مجید کی تعلیم اسی طرز پر ممکن نہیں...؟

اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ بچہ نفسیاتی طور پر یہ محسوس کرے گا کہ یہ کتاب صرف پڑھنے ہی کی نہیں بلکہ سمجھنے کی بھی ہے۔

کم سے کم وہ قرآن پاک کے الفاظ کے ساتھ اس کے معنی سے بھی مانوس ہوجائے گا اوراگر مکتب کا پورا ماحول اسی انداز کا بنادیا جائے تو چند سال میں ہمارا بچہ قرآن پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کو اچھا خاصا سمجھنے بھی لگے گا۔ بیشک وہ ابھی کوئی بہت بڑا مفسرقرآن نہیں بن پائے گا، اس کے لئے ایک وقت چاہئے، لیکن اس سے قرآن کو سمجھنے کا ذوق اور پھر بڑے ہوکراس کے مطالعے کا شوق یقیناً پیدا ہوجائے گا۔

ہمیں یقین ہے کہ طریقۂ تعلیم کی تبدیلی سے ایک ذہنی اورفکری انقلاب لایا جاسکتا ہے اور اس سوچ کو بدلا جاسکتا ہے کہ قرآن صرف تلاوت کے لئے ہے اس کا سمجھنا ضروری نہیں۔

بیشک ہمارے مدارس ومکاتب میں قرآن مجید کے تلفظ پر کافی توجہ دی جانے لگی ہے اوراب شروع سے ہی بچوں کو باتجوید پڑھانے کا رواج کافی حدتک ہوگیا ہے، اگراس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کے معنی اوراس کے ساتھ تحریر پر بھی دھیان دیا جائے تو بڑا فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔

❁ ❁ ❁

درویشی بھی عیاری، سلطانی بھی عیاری

از: ڈاکٹر ایم اجمل فاروقی
۱۵- گاندھی روڈ، دہرہ دون

جسٹس محترمہ گیتا متّل کے پابندی سے متعلق فیصلہ کے بعد ملک کے مختلف علاقوں میں ہوئے بم دھماکوں کے بعد طرح طرح کی قیاس آرائیاں میڈیا کی مرغوب غذا بن گئی ہے۔ ایک نسبتاً نیا پہلو زیر بحث لایا گیا ہے وہ مسلم غیرسرکاری اداروں کو ملنے والی مالی امداد کا ہے۔ بھارت سرکار کے اعداد وشمار کی روشنی میں اپنے اپنے انداز سے رنگ بھرے گئے ہیں۔ آغاز میں اس موضوع پر جاری کئے گئے اعداد وشمار اور سرکاری نقطۂ نظر پیش کرکے پھر اُس پر تنقیدی نظر ڈالی جائیگی۔ مختلف اخباروں میں الگ الگ انداز سے مسئلہ پر خیال آرائی کی گئی ہے۔ ہندی راشٹریہ سہارا کی سرخی سے ہی آپ مضمون کی زہرناکی کا اندازہ لگا سکتے ہیں ’’آتنک کی پونجی کی کنجی کہاں ہے؟ ہاتھ پاؤں مارتے خفیہ ایجنسیاں ہلکان‘‘ ۲۲/ستمبر ۲۰۰۸ء ۔

خبر میں بتایا گیا ہے کہ ملک میں ۲۰۰۵-۲۰۰۴ء میں ۱۴۵۱۷ غیرسرکاری ادارہ کام کررہے تھے۔ جنھیں ۵۱۰۵ کروڑ روپیہ بیرونی ممالک سے وصول ہوئے تھے۔ یہ رقم ۱۹۹۲ء میں ۹ سو کروڑ روپیہ تھی۔ ملک میں ہرسال ۱۰ کروڑ روپیہ کی مدد حاصل کرنے والے ۵۹ غیرسرکاری ادارہ N.S.O ہیں۔ ان میں ایک بھی مسلمان ادارہ نہیں ٪۸۰ عیسائی ہیں اور باقی ہندو ادارہ ہیں۔ ہندوستان میں ۱۵۲ ممالک پیسہ بھیج رہے ہیں جس میں صرف امریکہ کا حصہ ٪۳۴ یعنی ۱۶-ارب ۹۷ کروڑ روپیہ ہے۔ اٹلی ۳-ارب چار کروڑ، انگلینڈ ۶-ارب ۹۷ کروڑ روپیہ، ہالینڈ ۲-ارب ۳۷ کروڑ سالانہ بھیجے۔ سب سے زیادہ پیسہ دہلی، تامل ناڈو، آندھراپردیش، کرناٹک اور مہاراشٹر کو آرہا ہے۔ وزارت داخلہ اور محکمہ خزانہ یہ دیکھنے کی کوشش کررہے ہیں کہ مسلم N.S.O اور مدرسوں کو رقم کہاں سے مل رہی ہے؟ جواب ہے حوالہ کے ذریعہ۔ خبر پڑھتے ہی اقبال علیہ الرحمہ کا شعر ذہن میں آتا ہے کہ ؂

’خدایا تیرے یہ سادہ دل بندہ کدھر جائیں   کہ درویشی بھی عیاری اور سلطانی بھی عیاری‘‘

پیسہ آئے تو بُرے نہ آئے تو بھی برے۔ ہندوستان میں بڑے مدارس کی صف میں سب سے بڑا ادارہ غالباً دارالعلوم دیوبند ہے جس کا ۲۰۰۸ء کا سالانہ بجٹ محض ۱۱-کروڑ ۴۰ لاکھ کا ہے ایک دوسرا بڑا ادارہ جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ ہے جہاں ۴۵۰۰ طلباء طالبات پڑھتے اور رہتے ہیں اس کی اپنی بسیں ہیں جس کا سالانہ خرچہ ۱۶ کروڑ روپیہ ہے۔ بقیہ مدارس ان سے چھوٹے ہی ہیں اب جب ان سب سے بڑے مدارس کا کل بجٹ اتنے کا ہی ہے جتنا کم سے کم مدد لانے والوں کا حساب رکھا گیا ہے یعنی ۱۰ کروڑ سے اوپر پیسہ لانے والے اداروں کا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ

۱- بیشتر مسلم ادارہ اتنے بڑے ہیں ہی نہیں کہ ان کا خرچ پچاسوں کروڑوں میں ہو۔

۲- یہ ادارہ اپنا تمام بجٹ ملکی ذرائع سے ہی حاصل کر لیتے ہیں۔

۳- بڑی تعداد میں مسلم اداروں کے ساتھ وقف جائیدادیں منسلک ہیں۔ صرف بقرعید میں حلال ہوئے جانوروں کی کھال ہی اربوں روپیہ کی ہوتی ہے۔

۴- ۱۹۹۰ء میں مسلم ادارہ ایکمیو کی رپورٹ کے مطابق ہندوستانی مسلمان سالانہ ۹-ارب روپیہ صرف زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ امداد، عشر اور خمس کی شکل میں فصلوں کی زکوٰۃ بڑے پیمانہ پر ادا کی جاتی ہے۔

۵- ہر مسلمان پر عید کی نماز سے پہلے صدقۃ الفطر ادا کرنا ہے۔ ہندوستان میں مسلمان اگر پندرہ کروڑ بھی ہیں تو بھی تو صرف صدقۃ الفطر کی رقم ہی کتنے ارب روپیہ ہوگئی۔

۶- خرچ کی مد میں دیکھیں تو مسلم اداروں کے اخراجات دیگر اداروں کے مقابلہ میں ''نہ'' کے برابر ہوتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ کی تنخواہ اور سہولیات کا مقابلہ کسی بھی سینٹ فلاں اور فلاں کے اساتذہ کی تنخواہ، الاؤنس، کوٹھی، کار سے کر کے دیکھ لیں تو خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ باہر کے پیسہ کی ضرورت کیوں نہیں ہوتی؟

۷- یہ بات حکومت اور میڈیا شاید جان بوجھ کر چھپانا چاہتے ہیں کہ تمام مسلم ادارہ جب قائم کئے گئے تھے تو کسی بھی مسلم حکومت کے پاس اپنے خرچ کے لئے بھی پیسہ نہیں تھا۔ دارالعلوم اور دوسرے بڑے ادارہ اور جماعتیں اس وقت قائم ہوئی تھیں جب کالا سونا یعنی پٹرول دریافت بھی نہیں ہوا تھا۔ اُس وقت ہندوستان کے مسلمان خود مالدار تھے۔ ہندوستانی اصحاب خیر مکّہ اور مدینہ میں مسافر خانہ بناتے تھے اور مدرسہ چلاتے تھے۔ ہندوستان کے مسلمان حجاج کرام کی ضیافت کے لئے امداد بھیجا کرتے تھے۔ یہی حال علی گڑھ اور دیگر اداروں کے قیام کا ہے۔ پھر

ہندوستانی مسلمانوں کی بڑی تعداد دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے اور وہ اس پر ایمان رکھتی ہے کہ اصل سرمایہ وہ ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ کردیا۔ اسی نظریہ کے تحت وہ اپنی آخرت کے لئے اپنے والدین، اساتذہ، اعزہ واقربا، کے ثواب کے لئے خود بڑی مقدار میں رقمیں اداروں میں جمع کراتے ہیں۔ جس کی انہیں باقاعدہ رسیدات دی جاتی ہیں۔ اور حسابات مکمل رکھ کر آڈٹ کرائے جاتے ہیں۔ جن اداروں میں رقومات بیرونی ممالک کے اداروں سے آتی ہیں ظاہر ہے وہ دس کروڑ سالانہ سے کم ہوتی ہوں گی۔ اگر مسلم اداروں کا خرچ اتنا کم ہے کہ وہ اپنے وسائل سے اسے پورا کرلیتے ہیں تو انہیں مدد لے کر سرکاری بندشوں اور معائنوں میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور مسلم ادارہ خصوصاً مدارس اس معاملہ میں کتنے حساس ہیں اس کا اندازہ خود حکومت ہند کو بھی ہے کہ جب یہ ادارہ حکومت ہند اور صوبائی حکومتوں کی امداد لینے سے ہی گھبراتے ہیں تو باہر والوں کی مدد لے کر دوطرفہ معائنوں اور حسابات کے چکر میں کیوں پڑیں گے؟

ایک اور حقیقت کی طرف بھی دھیان دلانا چاہوں گا کہ تقریباً ایک عشرہ پہلے کے مشہور جین حوالہ کانڈ میں بڑے بڑے دیش بھگتوں کے نام سامنے آئے تھے۔ حالات یہ تھے کہ کسی بھی بڑی سیاسی پارٹی کے لیڈران کے نام سے لسٹ خالی نہیں تھی اس لئے سب چھوٹ گئے مگر کیا اس حوالہ ڈائری میں مسلم اداروں کے بھی نام تھے؟ اور آج ملک سے جو اربوں کھربوں روپیہ باہر کے بینکوں میں جمع ہورہا ہے کیا وہ بھی مسلم اداروں کا ہے یا ان ''دیش بھگتوں'' کا ہے جو مدرسوں کی آمدنیوں کے ذرائع کھوج رہے ہیں؟ واضح رہے کہ CBI کے سابق جوائنٹ ڈائریکٹر نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کا بیرونی ممالک میں اتنا سرمایہ ہے جو ہندوستان کے ۳۵-سال کے بجٹ کے برابر ہے۔ اور یہ تو تازہ خبر ہی ہے کہ جرمنی کی حکومت نے دنیا کے تمام ممالک کے پاس اطلاع بھجوائی کہ ان کے پاس ان بینکوں میں جمع رقوم کی تفاصیل لینا ہیں جو دنیا بھر کے مشکوک لوگوں کے ذریعہ بدنام ترین سوئس بینکوں میں جمع کرائی گئی ہیں۔ مگر کسی بھی ایشیائی ملک نے تاحال حکومت جرمنی سے رجوع نہیں کیا ہاں امریکہ اور یوروپ اور لاطینی امریکی ممالک نے ضرور رجوع کیا ہے۔ خبر یہ ہے کہ کچھ لوگ سپریم کورٹ میں مفاد عامہ کی رٹ دائر کرکے حکومت کو مجبور کریں گے کہ وہ ہندوستان کے لوگوں کی فہرست منگانے کے لئے سرکاری سطح پر معلومات حاصل کرائے تب سب دیش بھگتوں کا کچا چٹھا کھل جائے گا کہ اپنی کالی کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کے لئے دوسروں کے اجلے دامن کیوں داغدار کئے جارہے تھے۔

کتاب ''سیرت سلطان ٹیپوشہید'' پر ایک نظر

مؤلف: مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی

از: محی الدین خاں
سابق لکچرار، موتی نگر، بنگلور

حضرت ٹیپوسلطان شہیدؒ پر اب تک بے شمار کتابیں فارسی، اردو اور انگریزی زبانوں میں منظرعام پر آچکی ہیں۔ ان میں بہت سی کتابیں خود انگریزی مؤرخین کی بھی ہیں جو نواب حیدر علی خاں بہادر، شہید ملک وملت ٹیپوسلطان اور سلطنت خداداد کے سخت مخالف اور دشمن تھے، جن کے ہاتھوں ہی سلطان کی شہادت اور سلطنت کا زوال بھی ہوا تھا۔ سلطان کی شہادت کے بعد پہلی جامع، مفصل اور مستند کتاب سید میر حسین علی کرمانی کی ''نشان حیدری'' فارسی زبان میں منظرعام پر آئی۔ کرمانی سلطنت خدادا کے بانی نواب حیدر علی اور سلطان شہید کا معاصر ہی نہیں بلکہ سلطنت خداداد کا نمک خوار بھی تھا۔ اس کتاب کے بعد جتنی بھی کتابیں نواب حیدر علی وسلطان شہید پر منظرعام پر آئیں ان سب کا یہی کتاب ماخذ ومرجع رہی۔

اس کے بعد سب سے زیادہ مستند ومقبول کتاب محمود خاں محمود بنگلوری کی ''تاریخ سلطنت خداداد'' ہے، جو ۱۹۳۵ء کو منظرعام پر آئی۔

زیر بحث کتاب ''سریت سلطان ٹیپوشہید'' جس میں مصنف نے یہ دعویٰ پیش کیا ہے کہ ''سلطان شہید کی زندگی سے متعلق بعض اہم گوشے ایسے بھی تھے جس پر اب تک کسی بھی کتاب میں تفصیل سے روشنی نہیں ڈالی گئی تھی اور وہ پہلو اس (ٹیپوسلطان) کے داعی ومبلغ اسلام اور ایک داعیٔ حق ہونے کا تھا۔ اب تک کی تمام موجودہ کتابوں میں اس کو صرف بحیثیت ایک کامیاب حکمراں، ذہین سیاستداں، قابل منتظم اور بہادر سپہ سالار کے روپ میں پیش کیا گیا تھا۔''

دوسرا دعویٰ ''میر کرمانی اور محمود خاں بنگلوی نے اپنی کتابوں میں بعض غیر مصدقہ روایات وواقعات کو جگہ دی ہے اور اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے کسی معقول یا مضبوط حوالہ کے بجائے صرف اس طرح کے الفاظ استعمال کرنے پر اکتفا کیا ہے ''مشہور ہے'' ''کہا جاتا ہے''

''مقامی روایت ہے'' ان کو بنیاد بنا کر اہل نوائط کو معتوب وملعون کیا ہے، یہ کہاں کی دیانت داری ہے۔ اہل نوائط سے متعلق اکثر الزامات کے حوالے مقامی روایات ہیں۔ مثلاً محمود بنگلوی اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''جب انگریزوں نے (میسور کی آخری جنگ میں) قلعہ کا محاصرہ کیا تو اہل نوائط کے گھروں سے انگریزوں کو پلاؤ اور مٹھائی تقسیم کی جارہی تھی'' اور خود کہتے ہیں کہ یہ مقامی روایت ہے جس کا کوئی حوالہ نہیں دیا جاسکتا۔ اسی طرح ایک اور واقعہ بھی لکھا ہے کہ ''سلطان ٹیپو بدرالزماں کی لڑکی سے اپنی برادر نسبتی برہان الدین کا نکاح کرنا چاہتا تھا لیکن اس لڑکی نے اس رشتہ کو غیر اہل نوائط ہونے کی وجہ سے اپنی توہین سمجھ کر اسی رات خودکشی کو ترجیح دی۔''

تیسری دعویٰ: ''میسور کی آخری جنگ میں جب فرانسیسیوں نے دارالسلطنت کے انگریزوں کے محاصرہ کے بعد سلطان ٹیپو کو چتل درگ چلے جانے کا مشورہ دیا تو بدرالزماں خاں نائطہ نے یہ کہہ کر سلطان کو روک دیا کہ اس وقت آپ کے جانے سے پوری فوج میں بددلی پھیل جائے گی۔ اس لئے فوجی حکمت عملی کے تقاضہ کے تحت آپ کی موجودگی بے حد ضروری ہے۔ اس کے اس مشورہ کو ہم کیوں کر اس کی بدنیتی پر محمول کرسکتے ہیں جو رائے اس نے پیش کی وہ حقیقت پر مبنی تھی اور سلطان نے بھی اس مشورہ کو مخلصانہ سمجھ کر چتل درگ جانے کے اپنے ارادہ کو منسوخ کردیا۔ لیکن ہم ان سب چیزوں کے باوجود اس کا بھی فیصلہ نہیں کرتے کہ بدرالزماں خاں واقعی ذاتی طور پر اپنے دل سے بھی سلطان کا مخلص اور خیرخواہ تھا۔ لیکن جب تک اس کے متعلق غداری کے واضح ثبوت ہمیں نہیں ملتے اس کو ہم بے وفا ثابت کرنا دیانت داری وانصاف کے اسلامی اصولوں کے منافی سمجھتے ہیں۔ جہاں تک سوال ہے اس (بدرالزماں) کی ایک دفعہ نظر بندی کا تو جیسا کہ معلوم ہوا کہ یہ سب کھیل میر صادق نے اس سے اپنی ذاتی دشمنی کی بناء پر کیا تھا جس طرح اس نے ملک جہاں خاں کو غلط الزامات لگا کر سلطان کی شہادت تک مقید رکھا تھا، اس طرح کی ذلیل حرکتیں اپنے عہدہ ومنصب کا ناجائز فائدہ اٹھا کر میر صادق کسی سے اپنی ذاتی دشمنی نکالنے کے لئے ہمیشہ عادی تھا۔ اس لئے صرف اس کی نظربندی کو بنیاد بنا کر اس کی سلطان سے بے وفائی یا غداری ثابت کرنا ہمارے لئے مشکل ہے۔''

میر حسن علی کرمانی کی کتاب ''نشانِ حیدری'' کے تتمہ میں جو تاریخ درج ہے وہ ۱۳؍فروری ۱۸۰۳ء ہے جو سلطان کی شہادت (۵؍مئی ۱۷۹۹ء) کے صرف چار سال بعد کی ہے۔ ممکن ہے اشاعت آٹھ سال بعد ہوئی ہو۔ یہ بھی درج ہے کہ یہ کتاب سلطان کے شہزادوں یا ایک شہزادے کے

اصرار پر لکھی گئی تھی۔ نیز اس کتاب کو مصنف نے اپنی بے انتہا مصروفیت، کثرت مشاغل، سفر وحضر کی مشکلات کے باوجود مکمل کیا ہے۔ یہ مصنف کا خود ساختہ دعویٰ اور کرمانی پر بہتان ہے کہ ''کرمانی نے اپنی کتاب سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں کے حکم واصرار پر کلکتہ میں اپنی نظر بندی کے دوران لکھی تھی۔'' کرمانی کی انگریزوں کے پاس نظر بندی سے متعلق صرف جناب محبّ الحسن نے اپنی کتاب ''تاریخ ٹیپو سلطان'' میں تحریر تو کیا ہے مگر اس کا کوئی مستند حوالہ نہیں دیا ہے۔

محمود خاں بنگلوری جو سلطان شہید کے پڑوسی ہیں اپنی کتاب (تاریخ سلطنت خداداد) میں سلطان کے موافقین ومخالفین کی کتابوں کو کھنگالنے اور تمام کھرے کھوٹے حقائق وواقعات کی ممکنہ حد تک جانچ پڑتال کرنے کے علاوہ خصوصاً سرنگاپٹم کے ان تمام اجڑے ہوئے تاریخی مقامات کا بچشم دید مشاہدہ ومطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ مقامی باشندوں خصوصاً معمر بزرگوں سے مل کر صحیح حقائق وواقعات کا ادراک کیا ہے۔ جس وقت ۱۹۳۵ء اس کتاب کا پہلا ایڈیشن منظر عام پر آیا سلطنت خداداد کے زوال کو صرف ۱۳۵ سال کا عرصہ گزرا تھا۔ (۱۳۵ سال میں سے ۸۰/۷۰ سال جن معمر بزرگوں سے محمود خاں نے ملاقات کی ہے وضع کر دیئے جائیں تو بمشکل ۶۰/۵۰ سال پرانے واقعات) عوام الناس کو باپ، دادا سے سن کر محفوظ رکھنا کچھ بعید از قیاس نہیں۔ جب کہ بعض معمولی معمولی قسم کے حقائق وواقعات صدیوں تک نسل در نسل بیان ہوتے رہتے ہیں چہ جائے کہ ایسے مشہور ومعروف واقعات۔ مولانا حکیم عبدالحیٔ حسنیؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اپنی کتاب ''ہندوستان اسلامی عہد میں'' میں کئی جگہوں پر جن تاریخی مقامات وواقعات کا ذکر کیا ہے اس میں بھی ''مشہور ہے'' اور ''کہا جاتا ہے کہ'' جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مثلاً بابری مسجد کے بارے میں وہ تحریر کرتے ہیں کہ ''یہ مسجد بابر نے اجودھیا میں تعمیر کی تھی، جسے ہندو رام چندر جی کی جائے ولادت ''کہتے ہیں''۔ ان کی بیوی سیتا کا واقعہ مشہور ہے، ''کہا جاتا ہے'' کہ سیتا کا یہاں ایک مندر تھا...'' جب یہ اور اسی طرح دوسرے مؤرخین کی کتابیں بھی ہیں تو کرمانی اور محمود خاں کی کتابوں ہی سے ایسا ناروا سلوک کیوں؟ حالانکہ کرمانی نے اپنی کتاب میں کسی بھی جگہ اس طرح کے الفاظ استعمال نہیں کئے ہیں۔ اور نہ ہی اس کو اس کی ضرورت ہی تھی، کیونکہ وہ خود اپنی آنکھوں دیکھی اور اپنے دور کے حقائق وواقعات بیان کر رہا ہے۔

مصنف کا یہ کہنا کہ کرمانی اور محمود خاں نے اپنی کتابوں میں بعض غیر مصدقہ روایات وواقعات کو جگہ دی ہے اور مقامی روایات کو بنیاد بنا کر اہل نوائط کو معتوب وملعون کیا ہے یہ کہاں کی

دیانتداری ہے؟ اس کا کیا مطلب؟ کیا ان دونوں کتابوں میں موصوف کو صرف اہل نوائط ہی کے متعلق غیر مصدقہ روایات نظر آئے؟ خود انگریزی مؤرخ کرنل ولکس نے اپنی تاریخ مرتب کرنے میں بدرالزماں نائطہ سے (جو کہ سقوط سرنگاپٹم کے بعد بھی ایک عرصہ تک انگریزوں کے ٹکڑوں پر زندہ رہا) بہت مدد لی ہے، لیکن ساتھ ہی وہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ اس (بدرالزماں) کی باتوں میں سچائی نہیں ہوتی تھی۔ آخر کیا بات ہے کہ تمام مؤرخین ہاتھ دھوکر اہل نوائط کو بدنام کرنے میں جٹ گئے ہیں۔ انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ان دونوں کتابوں میں جہاں جہاں اور جن جن افراد کے بارے میں بھی آپ کی نظر میں جو غیر مصدقہ روایات و واقعات جگہ پا چکے ہیں ان سب کی نشاندہی کرتے۔ یہاں پر بھی مصنف کا یہ بہتان ہے کہ کرمانی نے مقامی روایات کو بنیاد بنایا ہے۔ اس طرح کا ایک لفظ یا ایک روایت بھی اس کتاب میں مذکور نہیں ہے۔

جہاں تک بدرالزماں نائطہ کی غداری کا مسئلہ ہے اس کی اس نظر بندی (قید) سے بھی بڑا اور کوئی ثبوت چاہئے؟ کیا یہ ایک ثبوت ناکافی ہے؟ خود میر صادق کو سلطان شہید نے ایک مرتبہ نظر بند کیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد سلطان ہی نے اس کو رہائی دے کر دوبارہ اسی عہدہ پر بحال کر دیا بلکہ بعد میں مزید اس سے بھی بڑا عہدہ (وزیر اعظم) تفویض کئے جانے کے باوجود اس نے سلطان سے صرف اس نظر بندی کا بدلہ برابر نمک حرامی سے لیتا رہا اور سلطنت کے زوال کا سب سے بڑا سبب یہی مردود و ملعون بنا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے افراد کی مثالیں ہیں جن کو سلطان نے مختلف وجوہات کی بنا پر صرف ایک ہی مرتبہ نظر بند کیا تھا، جیسے میر قمرالدین، غلام علی لنگڑا اور میر قاسم علی وغیرہ، بعد میں رہائی دے کر دوبارہ ان کو ان کے سابقہ عہدوں پر بحال کئے جانے کے باوجود انھوں نے سلطان سے نمک حرامی کی۔ دوسروں کی غداری کے اثبات کے لئے ان کی صرف ایک مرتبہ کی نظر بندی کافی ہے تو بدرالزماں خاں کے لئے اتنا ہی ثبوت ناکافی کیوں؟ اس کے برعکس مرہٹی بھگوڑا نومسلم ملک جہاں خاں (ڈونڈیا داغ) کو آخری وقت یعنی سقوط سرنگاپٹم ایک طویل عرصہ تک نظر بند رکھے جانے کے باوجود اس نے زوال سلطنت کے دن وہاں سے گلوخلاصی حاصل کر کے سلطان ٹیپو کے بڑے شہزادے فتح حیدر سلطان سے (جو کہ سقوط سرنگاپٹم کے وقت کری گڑ کی پہاڑی کے اس پار تھا) مل کر انگریزوں کے سامنے ہتھیار نہ ڈالنے بلکہ ان کے خلاف برسر پیکار رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔ مگر شہزادے نے بعض وجوہات کی بنا پر ہتھیار ڈال دیئے۔ اس کے باوجود اس نمک حلال ملک جہاں خاں نے بچے کچے مٹھی بھر جنگجوؤں کو ساتھ لے کر دو ڈھائی

سال تک ایک مستقل عذاب کی طرح دشمنان سلطنت خداداد انگریز، نظام اور مرہٹوں کا ناک میں دم کیئے ہوئے تھے۔اس کو کہتے ہیں نمک حلالی۔

دوسری بات یہ ہے کہ جہاں تک سلطان ٹیپو کے نمک حلال جانثاروں کا تعلق تھا سب نے مع فرانسیسیوں کے ایسے نازک وقت میں سلطان کو یہی مشورہ دیا کہ آپ خاموشی سے نکل کر چتل درگ روانہ ہوجائیں۔ اس کے برعکس جتنے بھی نمک حرام اور آستین کے سانپ غداران جیسے میر صادق، پورنیا، بدرالزماں نائطہ، غلام علی لنگڑا، میر معین الدین اور میر قمرالدین انھوں نے سلطان کو ہر ممکن طریقے سے روکنے ہی کی کوشش کی تاکہ درپردہ انگریزوں سے ان کی جو پلاننگ تھی اوران کے ناپاک ہاتھوں تھوڑی سی حقیر جائیداد یا چند سکوں کی خاطر بک چکے تھے کہیں فیل نہ ہوجائے اور سارے کیئے کرائے پر پانی نہ پھیر جائے۔

یہاں پر قابل مؤرخ نے صرف بدرالزماں کی غداری کو اس کے خیرخواہ یا بدخواہ ہونے کے فیصلہ کو اللہ کے سپرد کر کے تیسری جنگ میں میر صادق و پورنیا کا رول نبھانے والے سب سے بڑے نمک حرام وملت فروش دیوان مہدی علی نائطہ (سابق وزیراعظم) کی کھلی غداری سے اس کو مرادآباد کا مسلکاً شیعہ بتلا کر آگے بڑھ گئے ہیں۔ جبکہ تاریخ میں متفقہ طور پر اس کا اہل نوائط سے ہونا ثابت ہے۔تیسری جنگ میں جگ سرنگاپٹم محصور ہوگیا تو ان احسان فراموش نے عیدگاہ کا مورچہ جو اسی کے سپرد تھا اس قیامت خیز ہنگامے کے باوجود سلطان کے حکم کے بغیر ہی فوج میں ماہانہ تنخواہوں کی منادی کر کے مقابلہ کیئے بغیر ہی انگریزوں کے سپرد کردیا۔ بدرالزماں نے تو صرف سلطان کو چیتل درگ نہ جانے کا مشورہ دیا تھا جب کہ مہدی علی نے ایک اہم مورچہ بغیر کسی مزاحمت کے یونہی چھوڑ دیا۔ نیز جنگی آلات واوزار کے داروغہ کو اپنی مٹھی میں کر کے ''سن'' اور ''مٹی'' کے گولے تیار کرنے کا حکم دیا تھا تاکہ اس سے فرنگیوں کا جانی نقصان نہ ہو (چوتھی جنگ میں میر صادق و پورنیا نے بھی یہی کارآمد طریقے اپنائے تھے) اس معرکہ سے قبل ہی جاسوسی اور غداری کا راز فاش ہوجانے کی وجہ سے بہت سے غداروں کو مثلاً سید امام، لال خاں بخشی، میر نذر علی موکبدار اور اس کا بھائی اسمٰعیل خاں رسالدار وغیرہ بحکم سلطانی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس کے باوجود سلطنت میں سلطان کے بعد سب سے بڑا عہدے دار ہونے کے اس ننگ آدم مہدی علی نائطہ نے اتنی بڑی غداری کی۔ کرمانی نے لکھا ہے کہ ''سلطان نے ان سازشوں اور غداریوں کی تحقیقات شروع کرائی جن کی وجہ سے یہ شرعظیم برپا ہوا تھا۔ جب تمام عہدہ داروں،

ملازموں اور ساہوکاروں کے اعمال کا جائزہ لیا گیا تو پتہ چلا کہ یہ ساری سازش سلطان کے مدارالمہام (وزیراعظم) مہدی علی خاں نائطہ کی برپا کی ہوئی تھی۔ وہ چند کرناٹکی ساہوکاروں اور دوسرے نمک حراموں کے ساتھ درپردہ انگریزوں سے ملا ہوا تھا اور اپنے آقا کے ناموس وخانوادہ کو برباد کردینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نمک حرام نے نظم ونسق کے سارے شعبوں اور ذخائر میں ابتری پھیلا رکھی تھی۔ یہاں تک کہ اکثر توپوں کو عین لڑائی کے وقت اس بدبخت نے ریت اور مٹی سے بھروادیا تھا اس لئے توپچی موقع پر ان کو استعمال کرنے سے معذور رہ گئے تھے۔ اس تحقیقات کے بعد جتنے اشخاص مجرم ثابت ہوئے سلطان کے حکم سے ان کو کیفر کردار تک پہنچادیا گیا۔ اور ان خانہ خرابوں کا مال ومتاع، گھربار ضبط کرلیا گیا۔''

قابل مصنف اپنے پرکھوں کو غداری کے کلنک سے بچانے اور معصوم ثابت کرنے کیلئے کھلی دھاندلی، علمی بددیانتی اور اپنی مرضی کے مطابق واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرکے معصوم افراد کو ملزم ٹھہرارہے ہیں، آخر یہ کہاں کی دیانت داری اور کون سے اسلامی اصولوں کے تحت ہے؟ قابل مصنف بدرالزماں کو غداری کے کٹہرے سے نکال ان چند ناقابل فراموش جانثاروں کے کٹہرے میں لاکھڑا کر اس کے حق وناحق پر سرخی قائم کرکے فیصلہ اللہ کے سپرد کررہے ہیں تو مہدی علی کی اتنی بڑی غداری کو غداروں کے کٹہرے میں لاکھڑا کئے اور اس پر سرخی قائم کئے بغیر فیصلہ کس کے سپرد کررہے ہیں؟ مصنف کا یہ کہنا کہ اگر سلطان کو مجموعی طور پر اس قبیلہ (اہل نوائط) پر بھروسہ نہیں ہوتا تو وہ اپنی حکومت کے اعلیٰ فوجی ومذہبی مناصب پر انہیں کیسے بحال رکھتا؟ پہلی بات: تاریخ شاہد ہے اور مصنف بھی اچھی طرح واقف ہیں کہ حیدرعلی کے مقابلے سلطان ٹیپو کتنا رحم دل اور بردبار شہنشاہ تھا۔ معافی مانگ لینے پر وہ غداروں کو بھی معاف کرکے دوبارہ اسی عہدہ پر بحال کردیتا، بلکہ بعض مرتبہ اس سے بھی بڑا عہدہ ان کو تفویض کردیتا تھا جس کی کئی ایک مثالیں موجود ہیں۔ دوسری بات: میر صادق سے پہلے مہدی علی نائطہ ہی دیوان (وزیراعظم) تھا جو غداری ثابت ہونے کے بعد اس عہدہ سے معزول کردیا گیا۔ بقول کرمانی ان سب کو موت کے گھاٹ اتاردیا گیا۔ اور بعض مؤرخوں کے مطابق مہدی علی کے نسب کا لحاظ کرتے ہوئے اس کو صرف عہدے سے معزول کیا گیا۔ اب رہا بدرالزماں تو اس سے غداری بالکل آخری وقت میں ظاہر ہوئی ہے۔

تاریخ میں اس کی صراحت موجود ہے کہ سلطان سے اہل نوائط کی غداری بدرالزماں کی بیٹی سے سلطان کے نسبتی برادر برہان الدین سے شادی (۱۷۸۴ء) ہوجانے کے بعد اس کے غیر کفو

ہونے کی وجہ سے دلہن کی خودکشی (بقول کرمانی بدرالزماں کی دختر کشی) کے بعد ہی سے شروع ہوچکی تھی اور وہ سلطان سے اس کا بدلہ لینے کیلئے بے قرار اور درپردہ انگریزوں سے مل گئے تھے۔ اسی بنیاد پر مہدی علی نائطہ نے تیسری جنگ (۱۷۹۲ء) میں بغیر مقابلہ کے اپنا محاذ انگریزوں کے سپرد کردیا۔ اب آخری معرکہ (۱۷۹۹ء) میں پلاؤ اور مٹھائی سے اپنے کرم فرماؤں اور قید سے چھٹکارا دلانے والے نجات دہندوں کی خاطر تواضع کی جائے تو آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟ یہ تو حقیقت ہے کہ بغیر آگ کے دھواں نہیں اٹھتا، تو بغیر سازش اور خاطر تواضع کے مقامی طور پر اس کا چرچہ بھی نہیں ہوتا۔

تاریخ میں اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ زوال سلطنت کے بعد غداری کے صلے میں پنڈت پورنیا (دیوان میسور کا عہدہ) میر قمرالدین (گرم کنڈہ کی جائیداد) غلام علی لنگڑا، محمد رضا خطیب، چندمیر میراں، بدرالزماں خاں نائطہ اور غلام علی بخشی وغیرہ باقاعدہ انگریزوں سے حسن خدمات کے صلہ میں اپنا حق سعی اور ماہانہ مشاہرے بھی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

اور تاریخ اس بات پر بھی شاہد ہے کہ غداروں نے جو غداری کی تھی اس کا صلہ وہ سلطان کی شہادت کے چند ہی گھنٹوں میں اپنی آنکھوں کے سامنے ہی پالیا۔ ایک خدائی قہر وانتقام تھا جو فوراً اسی وقت قدرت کی طرف سے لیا گیا۔ گورے بھیڑیوں کی شکل میں ایک طوفان بدتمیز تھا جو مسلسل چار دن تک اہالیان سرنگا پٹم خصوصاً ان اونچی اونچی حویلیوں میں رہنے والوں کا مال وزر، عزت ووقار، عورتوں کی عصمت وناموس تک کو بہا لے گیا۔ سب کچھ ان غداران قوم وملت کی بھینٹ چڑھ چکا تھا۔ ان چار دنوں میں وہاں پر جو کچھ بھی ہوا اس سے انسانیت کی روح بھی شرما گئی۔ اس سے سرنگا پٹم کا شاید ہی کوئی گھر (سوائے شاہی گھرانے کے) محفوظ رہا ہو۔ ایسے مواقع پر سب سے پہلے بڑے بڑے گھرانے ہی اس کا نشانہ بنتے ہیں۔ اہم گھرانوں پر فوجی پہرہ لگادینے کے باوجود خود محافظ ہی درندے، بھیڑیئے اور لٹیرے بن گئے۔ مجبوراً انگریز جنرل کو خود اپنے ہی چند سپاہیوں کو بطور عبرت تختۂ دار پر لٹکانے کا فیصلہ کرنا پڑا۔

جہاں تک بدرالزماں نائطہ کی بیٹی سے ٹیپو سلطان کے نسبتی برادر برہان الدین کی شادی کا تعلق ہے وہ شادی ہوجانے کے بعد اسی رات دلہن نے خودکشی کی تھی۔ یہاں پر مسئلہ بدرالزماں نائطہ کی بیٹی کا سلطان ٹیپو سے یا ان کے کسی شہزادے سے شادی کا نہیں بلکہ سلطان کے نسبتی برادر برہان الدین کا تھا جو کہ لالہ میاں شہید چرکولی کا بیٹا تھا اور یہ اہل نوائط کے لئے غیر کفو میں سے ہونا

(بقول طبری اہل نوائط کا تعلق اہل قریش سے ہے) تو کسی حد تک صحیح ہے، اس لئے کہ لالہ میاں کا تاریخی اعتبار سے قریشی النسب یا عربی النسل ہونا بھی ثابت نہیں ہے۔ اور مصنف تاریخ یمن کی تحقیق کے مطابق نوائط ملاحوں کا ایک قبیلہ ہے جو بغداد سے نومیل پر ایک مقام وائط ہے، وہاں کے تاجر بنو وائط کہلائے جو بعد میں نوائط ہوگیا۔ راجح قول یہی معلوم ہوتا ہے اور قرائن بھی اسی کی شہادت دے رہے ہیں، ورنہ ایک عالی نسب قبیلہ کے دعویدار افراد سے ایسی غداری ممکن نہ تھی جو کہ ایک معمولی نومسلم ملک جہاں خاں کی وفاداری کا بھی مقابلہ نہ کرسکے۔

اور جہاں تک ٹیپو سلطان کے ایک داعی ومبلغ اسلام اور فراست ایمانی وحمیت دینی سے معمور ہونے کا ہے اس پر اس کتاب میں ضرور کچھ روشنی ڈالی گئی ہے اور بجز دوسری کتابوں کے کچھ اضافہ ہوا ہے اور یہ ایک اچھی چیز ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ نواب حیدر علی ناخواندہ تھے لیکن انھوں نے اپنے فرزند ٹیپو سلطان کی تعلیم وتربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی بلکہ ٹیپو کی دینی وعصری تعلیم و تربیت اور فنون عسکری وسپاہ گری میں قابلیت ومہارت کے لئے اس دور کے ماہرین علوم وفنون کو مختص کیا تھا، نیز انھوں نے اپنے دور کے بڑے بڑے علماء ومشائخ کو ملک کے مختلف گوشوں سے بلا کر اپنی قلمرو میں بسایا بھی تھا۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ٹیپو اور ان کے آبا واجداد درحقیقت قریشی النسب ہی ہیں جو کہ مکہ کا مشہور اور نبوی خاندان ہے۔ تو ٹیپو کی حمیت دینی وفراست ایمانی کا اثبات اسی سے ہوجاتا ہے، اس کے لئے دور کی کوڑی لانے کی چنداں ضرورت نہیں رہی۔

من جملہ اس کتاب کے مطالعہ سے صرف یہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ اہل نوائط پر غداری کا جو کلنک لگ چکا ہے ہر جائز وناجائز طریقہ سے اس کا ازالہ۔ درحقیقت مصنف خود اہل نوائط میں سے ہیں۔ بعض اوقات چھوٹے یا معمولی قسم کے داغ دھبے دھونے یا کھرچنے کی کوشش میں بعض بڑے قسم کے دھبے لگ جاتے ہیں۔ یہاں پر بھی یہی ہوا کہ بدرالزماں نائطہ کو چھوٹی غداری سے بچانے کی کوشش میں مہدی علی نائطہ کی بڑی غداری گلے کی ہڈی بن گئی۔ معلوم ہونا چاہئے کہ کسی بڑے ادارے سے کتاب کے شائع کرادینے اور نامور افراد سے مقدمہ وغیرہ تحریر کرادینے سے اصلی تاریخی حقائق وواقعات چھپائے نہیں چھپتے۔ بہرحال غداری غداری ہی ہے اور اہل نوائط میں سے صرف بدرالزماں خاں اور مہدی علی خاں ہی سے ثابت ہورہی ہے تو ان دونوں ہی کو غدار گردانناچاہئے نہ کہ پوری برادری کو، ورنہ یہ بات سراسر ظلم، دیانتداری اور انصاف کے عین اسلامی اصولوں کے منافی ہے۔